راوی فاؤنڈیشن انٹرنیشنل کے زیر اہتمام مسلسل اشاعت کا 15 واں سال

Monthly
Arxang
Lahore

ماہنامہ
ارژنگ
لاہور

مدیر اعلیٰ: عامر بن علی

مدیر: حسن عباسی

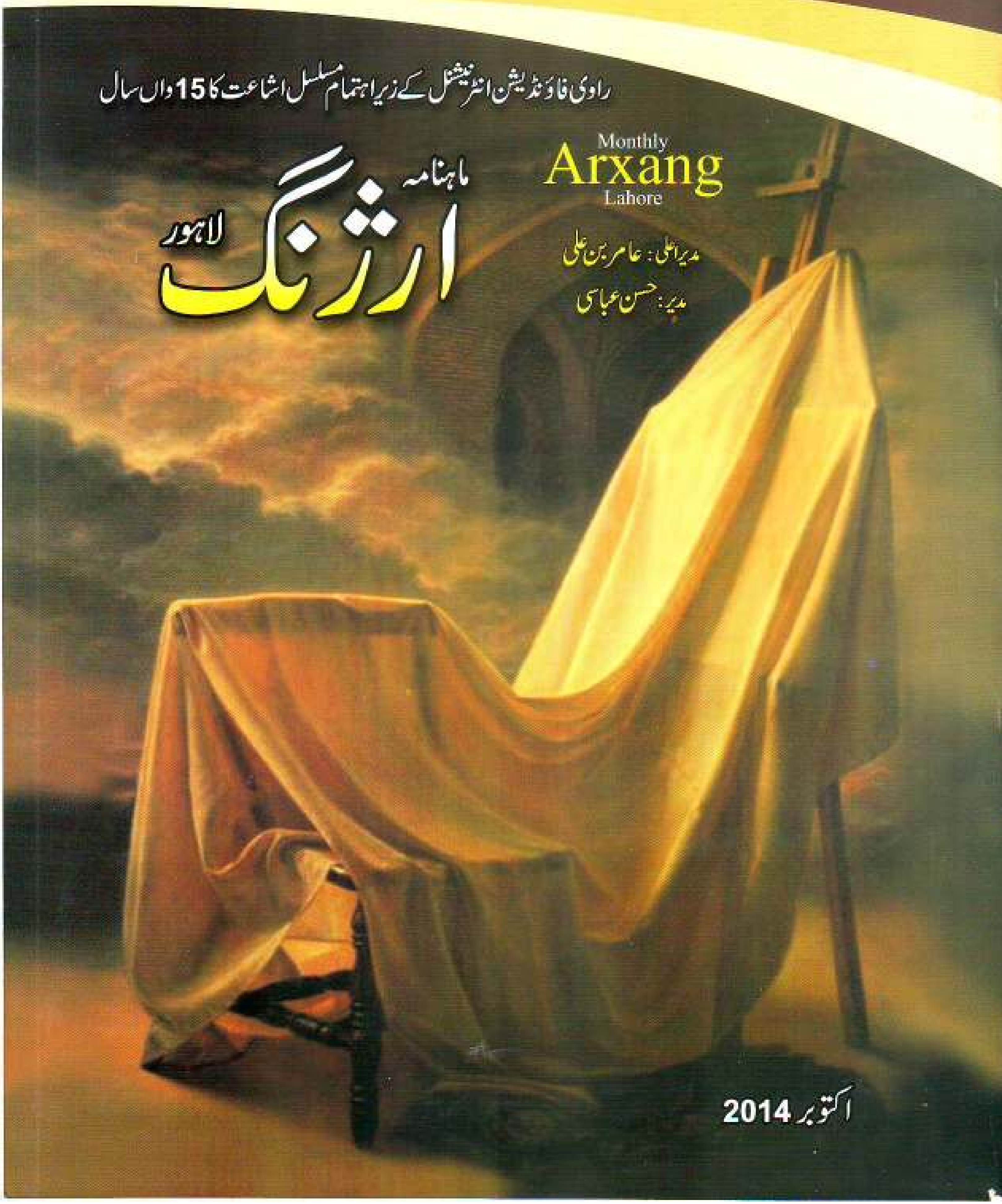

اکتوبر 2014

نالائق کالم نگاروں کی غیر معیاری تحریروں کے باعث احتجاجاً کالم نویسی شروع کی تھی

یاسر پیرزادہ

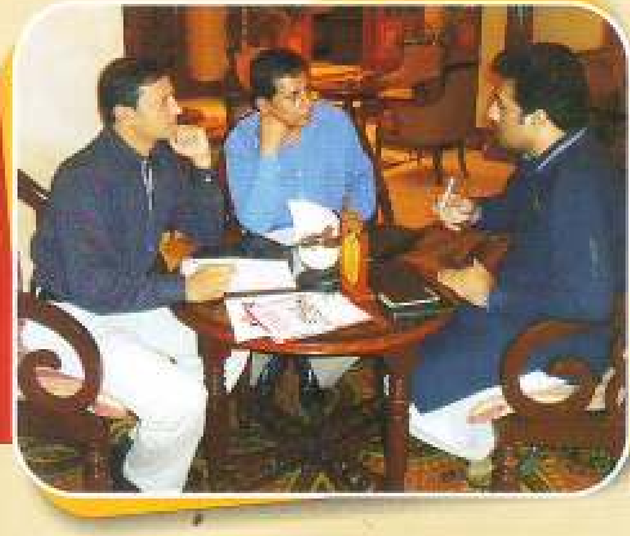

ملک کے معروف کالم نگار، نامور دانشور، ڈرامہ نگار اور بیوروکریٹ سے

عامر بن علی اور ابرار ندیم کی گفتگو

یاسر پیرزادہ کا شمار پاکستان کے مقبول ترین کالم نگاروں میں ہوتا ہے۔ بڑے مختصر عرصے میں انہوں نے بطور سنجیدہ تجزیہ کار اور اینکر پرسن اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے۔ بحیثیت ڈرامہ نگار بھی کامیابی نے اُن کے قدم چومے اور ان کے تحریر کردہ ڈرامے عوام سے سند قبولیت حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔ ادب و صحافت کے حوالوں کے علاوہ وہ ایک بیوروکریٹ بھی ہیں۔ پچھلے دنوں اس روشن دماغ اور ہمہ جہت باصلاحیت شخصیت سے گفتگو کرنے کا موقع میسر آیا۔ قارئین ارژنگ کی خدمت میں یہ بات چیت پیش کی جا رہی ہے۔

ارژنگ: آپ کا تعلق ایک علمی و ادبی گھرانے سے ہے، مگر ذاتی طور پر آپ کو یہ خیال کب اور کیسے آیا کہ تحریر کو ہی ذریعہ اظہار بنانا چاہیے؟

یاسر پیرزادہ: تحریر کو ذریعہ اظہار بنانے کا خیال تو یوں آیا کہ میں بچپن سے اپنے والد صاحب کو کالم نگاری کرتے دیکھ رہا تھا اور گھر کا ماحول خاصا ادبی تھا۔ دوسری وجہ وہ نالائق کالم نگار تھے جن کی بری تحریروں کی وجہ سے میں نے احتجاجاً کالم نگاری شروع کر دی۔ میں سوچتا تھا کہ اگر یہ نالائق کالم نگار لکھ سکتے ہیں اور ان کا کالم اخبار میں چھپ بھی جاتا ہے تو پھر میں یقیناً ان سے تھوڑا سا تو بہتر ہی لکھ سکتا ہوں۔ ویسے میں ان نالائق کالم نگاروں کا بہت شکر گزار ہوں۔ انہوں نے مجھے بہت موٹیویٹ کیا۔

ارژنگ: عطاء الحق قاسمی صاحب سے ہماری ذاتی عقیدت مندی سے قطع نظر، اگر کوئی بھی شخص پاکستان کے سب سے زیادہ پڑھے جانے والے چار، چھ کالم نگاروں کی فہرست بنائے تو یقیناً ترتیب کا فرق تو ہو سکتا

ہے۔ مگر ان کا نام ضرور شامل ہوگا۔ اتنے بڑے نام کی موجودگی میں خوف محسوس نہیں ہوا کہ آپ Survive کر پائیں گے؟

> پاکستان کے اخلاقی بحران میں اگر کوئی شخص اپنی غیر جانبداری برقرار رکھتا ہے تو یہ بدقسمتی کی بات ہے

یاسر پیرزادہ: ہاں! خوف تو موجود تھا۔ اور ایک خوف اس سے بھی بڑا تھا کہ جب آپ اپنے اوپر یہ چیک لگا لیتے ہیں کہ لوگ جب یہ پڑھیں گے اور سوچیں گے کہ یہ قاسمی صاحب کے بیٹے کی تحریر ہے تو اس سے لکھنے میں مشکل پیش آتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر کوئی دوسرا شخص لکھنا چاہے تو اس کے لیے یہ نسبتاً آسان تر ہوگا۔ مگر اس کا ایک فائدہ بھی ہے کہ جب آپ اپنے اوپر ایک کوالٹی چیک لگا لیتے ہیں تو پھر بہتر سے بہتر تحریریں سامنے آتی ہیں۔ باقی یہ اللہ تعالیٰ کی دین ہے، جس کو وہ عطا کر دے۔

ارژنگ: آپ ہمہ جہت شخصیت ہیں، کالم نگار، دانشور، ادیب، ڈرامہ نگار اور بیوروکریٹ، آپ کو اپنا کون سا تعارف زیادہ پسند ہے؟

یاسر پیرزادہ: مشکل سوال ہے۔ مگر آسان جواب یہ ہے کہ بطور کالم نگار۔ ویسے تو اگر نوکری بھی تہذیب اور ایمانداری سے کی جائے تو وہ بھی باعث اطمینان ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ مجھے اس ملک میں جو تھوڑی بہت شناخت ملی ہے وہ کالم نگاری نے دی ہے۔ اس لیے یہ تعارف مجھے زیادہ عزیز ہے۔

ارژنگ: اپنی پہلی تحریر کے بارے میں بتایئے جس کے متعلق آپ کا خیال ہو کہ اسے کسی کو سنانا چاہیے یا چھپوانا چاہیے؟

بقیہ صفحہ نمبر 31

MONTHLY ARXANG LAHORE

ماہنامہ ارژنگ لاہور

جلد نمبر ۱۶ ستمبر/اکتوبر ۲۰۱۴ء شمارہ نمبر ۸

حمد، نعت، سلام: ۳
مضامین: ○ مارکوئیز کی طلسماتی حقیقت نگاری / ڈاکٹر غافر شہزاد ، ۳
○ پروین شاکر کے گھاؤ / ڈاکٹر سلیمان عبداللہ ڈار ، ۶
○ "جاں ستاں" از حلیم قریشی / حمیدہ شاہین ، ۸
○ محبت اک سمندر ہے / رقیہ غزل ، ۱۰
○ پہلا گیت محبت کا / ناز اوکاڑوی ، ۱۳
طنز و مزاح: ○ بکرے / عطاء الحق قاسمی ، ۱۵
○ عذیر الطاف اور راج گمر / حافظ مظفر محسن ، ۱۸
افسانے: ○ سپیرا / عذرا اصغر ، ۱۹
○ اسکاؤٹ گرل / پرویز شہریار ، ۲۲
○ شہادت / آدم شیر ، ۲۸
شعری گوشے: اقبال راہی ، قیصر خالد ، اعظم کمال ، رابعہ صفدر حسین صفدر
حکیم سلیم اختر ، رائے عابد علی ، زاہد محمود شمس ، عاشق حسین ، میاں محمد مرغوب
سیدہ شبانہ زیدی ، پیر عبدالرؤف شاہ نبی پوری ، احتشام جمیل شامی ، ساجد علی ساجد
نازیہ حسن ناز ، اقبال پیام ، ۳۲ تا ۴۶
متفرق شاعری/غزلیں، نظمیں: ۴۷ تا ۵۳
گوشۂ نئی آوازیں: جویریہ ایوب ، معصومہ بتول ۵۴ تا ۵۶
ادبی خبریں، تقریبات ، ۵۷
تبصرۂ کتب ، فلیپ ، آراء ، ۵۹
پنجاب رنگ: ڈاکٹر محمد یونس احقر (گوشۂ نعت) ، ۶۳
○ شیشے تے کھڑدے پھلاں دی واشنا / ناز اوکاڑوی ، ۶۵
ڈاکٹر سعید الفت (شعری گوشہ)، محمد جنید اکرم (شعری گوشہ) ۶۷ تا ۶۸
پنجاب رنگ/متفرق شاعری ، ۶۹
نامہ ہائے احباب ، ۷۰

مدیر اعلیٰ: عامر بن علی مدیر: حسن عباسی

مدیران اعزازی: ڈاکٹر صغرا صدف ، ابرار ندیم تن دیپ تمنا

نائب مدیر: زبیر بشیر ، بدر سیماب ، کامران ندیم

مدیر پنجاب رنگ و انچارج شعبہ اشتہارات: ناز اوکاڑوی

قانونی مشیر: کامران ناشط

برائے خط و کتابت

ماہنامہ ارژنگ

F-3 الفیروز سنٹر غزنی سٹریٹ، اُردو بازار لاہور
0300-4489310
Nastalique786@gmail.com

قیمت فی شمارہ 60 روپے زر سالانہ مع ڈاک خرچ 1000 روپے

سالانہ ممبر شپ مع ڈاک خرچ (پاکستان) 1000 روپے

سالانہ ممبر شپ مع ڈاک خرچ (برائے بیرون ملک پاکستان) 5000 روپے

رابطہ 0331-4489310 0300-4489310

ارژنگ بیرون ملک

○ امریکہ، انیلہ بھلر ○ کویت، خالد سجاد ○ اسپین، صائمہ ملک
○ بحرین، اقبال طارق ○ یو کے، سعدیہ سیٹھی ○ فرانس، اسد رضوی
○ دوحہ، قیصر مسعود ○ ناروے، ارشد شاہین ○ آسٹریلیا، ظفر اسلام
○ سعودی عرب، اسلم گمان ○ شارجہ، حفیظ عامر ○ ڈنمارک، اقبال اختر
○ دبئی، سلیمان جاذب ○ کینیڈا، طارق سیال ○ مسقط، قمر ریاض

Far East Marketing Co.
Tokyo, 156-0083, Japan

... سے چھپوا کر اردو بازار لاہور سے شائع کیا

حمد، نعت، منقبت

حمد

سوادِ شب کو جو دن کے پیکر میں ڈھالتا ہے
وہی خدا پتھروں سے چشمے نکالتا ہے
سمندروں کا سکوت بھی ہے اسی کے دم سے
جو پانیوں کی تہوں سے موتی اُچھالتا ہے
جھلک رہا ہے سیاہ راتوں میں اُس کا پرتو
وہ دن کے رُخ پر چراغ منظر اُجالتا ہے
بڑا رحیم و کریم ہے وہ خدائے برتر
جو سر پہ آئی ہر ایک آفت کو ٹالتا ہے
وہی تو ہے جو مرا سہارا ہے زندگی میں
کبھی جو میں لڑکھڑاؤں مجھ کو سنبھالتا ہے
اُسی کی قدرت کی ہیں گواہی حسین منظر
رضؔا جو مٹی میں تخمِ ہستی کو پالتا ہے

علی رضا/ساہیوال

ہدیہ نعت

قابو میں نہیں گردشِ دوراں مرے آقاؐ
مدت سے پریشاں ہیں مسلماں مرے آقاؐ
بدلے گی کبھی عالمِ اسلام کی تقدیر
حالات نہیں رہتے ہیں یکساں مرے آقاؐ
کس واسطے ہوں اتنا پشیماں نہیں معلوم
اشکوں سے نم آلود ہے داماں مرے آقاؐ
دیدار کی حسرت لیے دُنیا سے نہ جاؤں
تکیے مری جانب رُخِ تاباں مرے آقاؐ
امداد مری کیجیے سامانِ بقا سے
اب تک تو جیا بے سروساماں مرے آقاؐ
اک میرے لیے اُمتی ہونے کا شرف ہے
میں تیری شفاعت پہ ہوں نازاں مرے آقاؐ
منصورؔ ہی طالب نہیں طیبہ کی ہوا کا
پھرتے ہیں کئی چاک گریباں مرے آقاؐ

مظفر حسن منصور/جوہرآباد

نعتِ رسولؐ

مصطفیٰؐ کی آمد تھی جشن تھا بپا ہر سُو
عکسِ مصطفیٰؐ میں تھا جلوہ گر خدا ہر سو
مشکبو فضائیں تھیں بے بہا عطائیں تھیں
خوشبوئیں لٹاتی تھی دہر میں ہوا ہر سو
آپؐ پر درودوں کی بارشوں کا موسم تھا
گونجتی تھی عالم میں ایک ہی صدا ہر سو
رحمت اللعالمینؐ جب جلیلؔ آئے تو
رحمتوں کی دنیا میں چھا گئی گھٹا ہر سُو

احمد جلیل/اوکاڑا

نعت بحضورِ سرورِ کونینؐ

کرم کی ابتدا وہ ہیں کرم کی انتہا وہ ہیں
مدینے میں وہ رہتے ہیں فلک پر بھی ہے گھر اُن کا
مجسم نور ہیں پھر بھی حوالہ ہے بشر اُن کا
سمندر فیض کا وہ ہیں مکمل رہنما وہ ہیں
کرم کی ابتدا وہ ہیں کرم کی انتہا وہ ہیں
گلابوں میں مہک اُن کی ستاروں میں ضیاء اُن کی
سحر میں نور ہے اُن کا سکونِ شب کا عطا اُن کی
نظاروں میں سرور اُن کا دو عالم میں ثناء اُن کی
نہیں ٹلتی نہیں ٹلتی خدا سے بھی دُعا اُن کی
حبیبِ کبریا وہ ہیں محمدؐ مصطفیٰؐ وہ ہیں
کرم کی ابتدا وہ ہیں کرم کی انتہا وہ ہیں
نظر جس سمت کر دیں وہ دُکھوں کو بے نشاں کر دیں
اسیروں کو رہائی دیں سزا کو رائیگاں کر دیں
کھلا دیں پھول صحرا میں زمیں کو کہکشاں کر دیں
بنا کر شاہ منگتے کو خودی کو رازداں کر دیں
امیر دوسرا وہ ہیں وکیلِ بے نوا وہ ہیں
کرم کی ابتدا وہ ہیں کرم کی انتہا وہ ہیں

عمران سلیم/لاہور

منقبت

(درشانِ امیرالمومنین، امام المتقین
حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام)

ہو کہکشاں سے سوا کیوں نہ خاکِ کوئے علیؑ
جمالِ آیہ حق ہے جمالِ روئے علیؑ
علیؑ کے دستِ تصرف میں کبریا کی رضا
وہ کبریا کا عدو ہے جو ہے عدوئے علیؑ
رسولؐ نے جو سنی ہفت آسماں سے پرے
وہ گفتگوئے خدا تھی کہ گفتگوئے علیؑ
نثار باغِ جناں تجھ پہ اے دیارِ نجف
کہ تیری خاک سے آتی ہے مجھ کو بوئے علیؑ
امیرِ وقت کو کیا آ پڑی کوئی مشکل
کہ ہو رہی ہے مدینے میں جستجوئے علیؑ
قضا نے وار کیا بھی تو پشتِ سر پہ کیا
کسے مجال تھی آتا جو روبروئے علیؑ
نہ شاہِ کشورِ نغمہ نہ تاجدارِ سخن
مگر شکیبؔ کو کہیے گدائے کوئے علیؑ

شکیب جلالی (مرحوم)

مارکوئیز کی طلسماتی حقیقت نگاری

ڈاکٹر غافر شہزاد/لاہور

گابریئل گارسیا کوئیز لاطینی امریکہ کا بیسویں صدی عیسوی کا صاحب طرز افسانہ نگار، صاحب اسلوب ناول نگار اور صحافی 87 برس کی بھرپور زندگی گزارنے کے بعد گزشتہ دنوں انتقال کر گیا۔ دنیا بھر کے علمی و ادبی حلقوں میں اس کے انتقال کی خبر نہایت افسردگی سے سنی گئی۔ تعزیتی قرار دادیں پیش ہوئیں۔ اس کی یاد میں اور اس کے فن اور شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو اُجاگر کرنے کے لیے اجلاس ہوئے۔ وہ عظیم ناول نگار اور ناقابل فراموش صحافی تھا جس نے مخصوص زاویہ نگاہ سے دنیا کے منظر نامہ کو نہ صرف دیکھا بلکہ اپنے گرد و پیش کی زندگی کو اپنی تہہ در تہہ مخفی صداقتوں کے ساتھ الفاظ کے روپ میں ڈھالا۔ ہم خوش نصیب ہیں کہ ہم نے مارکوئیز کے عہد میں اس کی زندگی میں اس عظیم تخلیقی سرمائے کی پراثر فضا کو اس کے ہمراہ محسوس کیا۔ اپنے ناولوں کے ان کرداروں کو کہ جو اس کی زندگی میں اس لیے متعارف ہوئے اور پھر اس کے چلے جانے کے بعد بھی زندہ ہیں، کو امر کر دینے والا مارکوئیز ایک منفرد اور توانا ناول نگار تھا جو آنے والی کئی صدیوں تک زندہ رہے گا کہ جب تک ناول میں نئے رجحانات متعارف نہیں ہو جاتے بالکل اس طرح جیسے فرانس اور روس کے ناول نگاروں کے بعد کافکا، میلان کندیرا اور گارسیا مارکوئیز نے نئے اُفق دریافت کیے۔

گزشتہ تین چار ہزار سالوں سے دنیا بھر کے علمی و ادبی اور فکری کارناموں میں جو مہابیانیے متعارف کروائے گئے وہ ابھی تک تخلیقی ادب کے دامن کو اپنی گرفت میں لیے ہوئے ہیں۔ ان مہابیانیوں میں خیر اور شر کے درمیان مسلسل اور مستقل جنگ، سچائی اور کذب کی زور آزمائی، حقیقت کی تہہ تک رسائی کے لیے مذہبی اور سماجی سطح پر مفروضے اور توہمات، وقت کا اُفقی یا دائری سفر وغیرہ شامل رہے ہیں۔ حیات و کائنات کی تخلیق اور اس کا مقصد اور اس کا متوقع انجام صوفیاء اور دانشوروں سے لے کر عام آدمی تک اور انیسویں بیسوی صدی میں سائنس والوں تک تحقیق و تحریر کا یہ موضوع رہا ہے۔ اسٹیفن ہاکنگ پہلا شخص تھا جس نے وقت کی مختصر تاریخ نامی کتاب بیسویں صدی کے وسط میں لکھ کر قدیم مسلمات کے مہابیانیے کو چیلنج کیا۔ اس نے وقت کے اُفقی اور دائری دونوں انداز کے سفر کو عمومی مشاہدے اور دلیل کے ساتھ رد کیا۔ وقت کے دائروی سفر کا نظریہ خاص طور پر برصغیر پاک و ہند کی قدیم معاشرت اور آواگون جیسے نظریات کو بڑھاوا دیتا رہا ہے۔ اسی طرح انسان کی پیدائش سے لے کر موت تک کے زندگی کے سفر کو اُفقی سفر قرار دیا جاتا رہا۔ مگر اسٹیفن ہاکنگ نے جب وقت کے نظریات اور تصورات کو پیش کرتے ہوئے بلیک ہول تھیوری کو وضاحت کے ساتھ پیش کیا تو اس کے اثرات ادب پر بھی پڑے۔ فرانسیسی اور روسی ناول نگاروں نے سترہویں صدی کے پہلے نصف تک جو ناول تخلیق کیے ان میں عموماً وقت کا اُفقی تصور پیش کیا جاتا رہا۔ آخری دہائیوں میں حیات و کائنات، انسان و فطرت کے بارے میں پیش کردہ مختلف نظریات، ارتقاء کے بدلتے ہوئے تصورات کی بنیاد پر اہم اور بڑے ناول دنیا بھر کی زبانوں میں تخلیق کیے گئے۔ جنھوں نے گزشتہ ڈیڑھ دو صدیوں سے قارئین اور تخلیق کاروں کو مسحور کیا ہوا تھا۔ وقت کے اس تصور میں زمان و مکان کے باہمی تعلق کو مضبوط تر کر کے پیش کیا جاتا رہا۔ ہمنگوے، لیو ٹالسٹائی، دوستوفسکی، بورخیس، کافکا، میلان کندیرا اور گابریئل گارسیا مارکیز ان درجنوں ناول نگاروں میں شامل ہیں جنھوں نے ناول یا افسانے کے کرداروں کو گہرائی کی کئی پرتیں عطا کیں۔ روزِ اوّل سے ناول نگار اپنے کرداروں اور کہانی کے باہمی تعلق کی پیش آنے والی حقیقت کا ادراک کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں اور ایک حد تک یہ جینئس اپنے مقاصد میں کامیاب بھی ہوئے مگر یہ کامیابی حتمی اور آخری سچائی نہ بن سکی۔ ہر کردار کی اپنی سوچ، فکر اور زاویہ نگاہ کے تحت صورت حال کی پیش کش مختلف زاویوں سے ہوتی رہی ہے۔ جس کے سبب حتمی سچائی تک رسائی محض ایک خواب بن کر رہ گیا۔ انسان کبھی تو کرداروں کے جنگل میں اپنے چھ حواسوں کے ساتھ چند لمحوں سے لے کر چند صدیوں تک پیش آنے والے

واقعات کی سچائی کو تلاش کرتا رہا۔ کبھی اپنی تنہائی اور مراقبے میں حیات و کائنات کے تہہ دار معاملات کی گرہیں کھولنے میں مگن رہا۔ کچھ لوگ ایسے بھی رہے ہیں جو انسانوں کے جنگل میں بھی اپنے گرد و پیش میں تنہائی اور اکیلے پن کا حصار تان لینے کی صلاحیت رکھتے ہیں تاکہ ایک جانب کشاکش حیات سے آنکھیں چار رہیں اور دوسری جانب تنہائی اور مراقبے میں قوت یکسوئی کے ساتھ ان وقوعات کی اصل کو جان سکیں۔ مارکوئیز ان ہی قسم کے لوگوں میں سے ایک تھا۔

مارکوئیز نے ایک جانب یہ طے کیا ہوا تھا کہ انسان کی اپنی زندگی اور پیش آنے والے واقعات اور کردار ایک بڑے کینوس پر ایک بڑی کہانی کا حصہ ہوتے ہیں۔ وہ فاکنر اور میلول کی طرح اس بات کا تائید کنندہ تھا کہ ہمارے تمام ناول اور افسانے بڑی سطح پر ایک ہی کتاب کے مختلف ابواب مگر ہر باب اپنی جگہ جگہ پر ایک مکمل ناول یا کہانی ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مارکوئیز کے ہاں حقیقی زندگی کے کردار اپنے مختلف نوع کے روپ میں اس کے مختلف ناولوں یا کہانیوں میں بار بار در آتے ہیں۔ یہ کردار خود کو دہراتے نہیں ہیں بلکہ ہر ناول کہانی میں ان کرداروں کی مختلف صفات کو خاص زاویوں سے پیش کیا جاتا ہے اور یوں یہ کم و بیش ایک الگ کردار کے روپ میں نئے ناول میں زندہ ہو کر ہمارے سامنے آن کھڑے ہوتے ہیں۔ ہم ان کو پہچان لیتے ہیں مگر جب ان کے خد و خال کا باریک بینی سے جائزہ لیتے ہیں تو ایک ہی کردار کئی شکلوں اور صورتوں میں الگ الگ ان ناولوں اور کہانیوں میں متحرک نظر آتا ہے۔ یہ کردار ہمیشہ صالح اور مثبت روپ میں ہی از سر نو ظاہر نہیں ہوتے، کہیں کہیں یہ منفی صفات بھی اپنے ہمراہ لے آتے ہیں۔ کردار نگاری اور کہانی کی پیش کش کا یہ طریقہ نہایت پیچیدہ، الگ، منفرد اور تہہ دار ہے۔ اس کی اصل کو پالینے کے لیے ہمیں بار بار مختلف ناولوں کی غواصی کرنا پڑتی ہے۔ تب کہیں جا کر حیات و کائنات کی پیچیدگیوں میں مشابہات اور مشترکات ابھر کر کنارے آن لگتے ہیں۔ ورنہ اپنی اپنی منفرد حیثیت سے یہ تخلیقی فن پارے اپنی جگہ پر مکمل، گہرے، تہہ دار اور معانی کی کئی پرتیں ایک ہی وقت میں لیے ہوتے ہیں اور مارکوئیز کا کمال فن یہی ہے کہ وہ اپنی تخلیقی گرفت میں ان وقوعات اور کرداروں کو لے کر گزرے وقتوں کے مہابیانیے کو توڑتا ہوا مستقبل میں اس طرح توانائی اور مؤثر انداز سے گھس جاتا ہے کہ اس کے افسانوں میں پیش کیے جانے والے کردار جو حقیقی زندگی میں اس وقت جس مقام پر ایستادہ ہوتے ہیں، آنے والے وقتوں میں مارکوئیز کو پیش کش کے مطابق حقیقی زندگیوں میں ڈھلتے چلے جاتے ہیں۔ اس کی ایک مثال اس کی ماں ہے جو ارسلہ کے نام سے ایک سے زائد ناولوں میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ مگر پھر جیسے ناولوں میں اس کو مستقبل کے حوالے سے پیش کیا جاتا ہے۔ ارسلہ حقیقی زندگی میں آنے والے سالوں میں ویسے ڈھل کر وہی شباہت اختیار کر لیتی ہے۔ اسی طرح جس وقت وہ اپنا ناول ''کرنل کو اب کوئی خط نہیں لکھتا'' تحریر کرنے کے لیے گوشہ نشیں ہوتا ہے مگر بیوی کے ساتھ ناول کی جزئیات کے مباحث ہوتے رہتے ہیں اور جب ناول مکمل کرنے کے بعد مارکوئیز کمرہ سے باہر نکلتا ہے تو اس کی بیوی اس کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ لگائے بغیر چونکہ وہ اس حد تک خود بھی اس کے اندر جذب ہو چکی ہوتی ہے، جان جاتی ہے کہ کرنل مر چکا ہے۔ اس کے منہ سے غیر ارادی طور پر نکلتا ہے ''کیا کرنل مر گیا؟'' یہی میجک ریلزم ہے کہ مارکوئیز حقیقی اور طلسماتی فضا کو یوں باہم مدغم کر دیتا ہے کہ دونوں کی سرحدوں کی تمیز و تفریق مٹ جاتی ہے اور قاری پر اسراریت کے اندر اپنے حواس کھو کر مارکوئیز کے تخلیقی کرداروں کے حواس کے ساتھ زندہ رہنے لگتا ہے۔ مارکوئیز نے ''تنہائی کے سو سال'' اور ''کرنل کوئی خط نہیں لکھتا'' اور ''ایک پیش گفتہ موت کی سرگزشت'' تینوں ناولوں کی پیش کش کے اعتبار سے الگ الگ زبان اور اسلوب کا انتخاب کیا۔ ''تنہائی کے سو سال'' ناول اس کے اندر پندرہ سال تک لکھا جاتا رہا۔ ''ایک پیش گفتہ موت کی سرگزشت'' کو مارکوئیز نے تین بار لکھا اور پھر تیسری بار لکھے گئے مسودے کو بھی نہایت باریک بینی سے کانٹ چھانٹ کر کے متن کے معیار اور کفایت لفظی کو اس سطح پر لے کر آ گیا کہ جہاں ایک جملہ بھی کاٹنے سے پورا تاثر دھڑام سے نیچے آن گرتا ہے۔ فن کا یہ عروج اور کمال کی یہ منزل کئی دہائیوں کی ریاضت کے بعد ہاتھ آتی ہے۔ ''ایک پیش گفتہ موت کی سرگزشت'' مارکوئیز کی صحافتی زندگی کا تیس سال پرانا ایک واقعہ تھا کہ جب وہ اصل حقائق کی تلاش میں ان سب کرداروں سے

ملا۔ اس وقت کی اخبارات کی رپورٹیں دیکھیں اور تیس سال بعد اس کو صحافت کی زینت بنایا۔ اس کہانی کے کردار اور کرداروں کی باہمی کشمکش اور حرکت اپنے اندر ایسی توانائی لیے ہوئے ہے کہ پڑھنے والا اگر لیٹ کر پڑھ رہا ہو تو اُٹھ کر بیٹھ جاتا ہے اور پھر اکڑوں بیٹھ کر نہایت ساکت و جامد ناول کے ختم ہونے تک یونہی متوجہ بیٹھا رہتا ہے۔ اس کے کانوں کی شریانوں کا فشارِ خون بڑھتا جاتا ہے۔ ناول کے آغاز میں ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ دو بھائی ایک تیسرے اہم فرد کو قتل کرنے جا رہے ہیں۔ قتل کرنے کے لیے وہ اپنی چھریاں تیز کروانے قصائی کے پاس جاتے ہیں۔ وہاں بھی اور گلی محلے میں جدھر بھی جاتے ہیں مسلسل بتاتے چلے جاتے ہیں کہ وہ اس کو قتل کرنے جا رہے ہیں اور قتل ہونے والے کو معلوم ہے کہ وہ قتل ہونے جا رہا ہے۔ اب ایسی صورت حال میں بستی کے ہر فرد کو ان افراد کی حرکات وسکنات کا علم ہوتا ہے۔ مگر پھر بھی وہ اس کو قتل کر دیتے ہیں۔ ناول کے تین چوتھائی حصے میں پہنچ کر معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کو کیوں قتل کرنے کے درپے ہیں۔ مارکویز کا یہ عجیب و غریب ناول اپنے اندر ایسی طلسماتی فضا رکھتا ہے کہ پڑھنے والا اگر ایک بار اس کے حصار کی لپیٹ میں آ جائے تو پھر باہر نکلنے میں بھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اپنی لاء کی تعلیم نامکمل چھوڑ کر چھوٹی موٹی صحافیانہ ذمہ داریوں کو نبھانے والا شخص مارکویز عمر کے ایک بڑے حصے تک نہایت غربت اور کسمپرسی میں نبھا کرتا رہا اور جب قسمت مہربان ہوئی اور اس کے ایک ناول کی تین کروڑ کاپیاں بک گئیں، پھر تو اس پر اشرافیہ اور بالا طبقے نے اپنے دروازے کھول دیے اور روزانہ کے حساب سے اس کی صحبت کے متمنی رہنے لگے۔

مارکویز کے ناولوں میں در آنے والی تنہائی اس کی زندگی کی تنہائی ہے جسے اس نے ہمیشہ اپنے ساتھ رکھا اور اوڑھنے اور بچھونے کا کام لیتا رہا۔ ''وبا کے دنوں میں محبت'' کے بنیادی کردار اس کے ماں باپ تھے۔ ''کرنل کو اب کوئی خط نہیں لکھتا'' کا کرنل اس کا نانا تھا اور اس کے ناولوں کی طلسماتی فضا کو ترتیب دینے میں معاونت کرنے والی اس کی خالائیں جادوگرنیاں تھیں۔ بقول مارکویز اس نے اپنے تخلیقی سفر میں ایک جملہ بھی ایسا نہیں لکھا جو حقیقت پر مبنی نہ ہو۔ اس دعویٰ سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس تخلیقی سفر میں طلسمات اور حقیقت پر مبنی فضا باہم کیسے گھل مل گئی تھیں۔ لہٰذا وہ جو بھی لکھتا، جو ہو چکا ہوتا اس کو باریک بینی اور مخصوص زاویہ نگاہ سے پیش کرتا اور جو ہونے والا ہوتا اس کو بھی ایسے مؤثر اور کشف انگیز طریقے سے ناولوں کا جزو بناتا کہ طلسماتی اور جادوئی طور پر اس کے کردار حقیقی زندگیوں میں آنے والے وقتوں میں ویسے ہی ہوتے چلے جاتے اور یہی مارکویز کی تخلیقی اپج کا کرشمہ ہے جس کو عام آدمی گرفت میں نہیں لے سکتا۔ وہ اپنے ناولوں میں وقت کے اُفقی یا دائری سفر میں کرداروں کو پیش نہیں کرتا بلکہ کہیں زمان رُک جاتا ہے مکان بدل جاتا ہے کہیں مکان رُک جاتا ہے زمان متحرک ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے ناولوں میں کثیر جہات میں وقت کی مسافت طے کرتا ہے اس سبب سے اس کے ناول بار بار پڑھنے پر نئے نئے مفاہیم قاری پر کھولتے ہیں۔ اردو ناول کی اکیسویں صدی مارکویز، کافکا اور کندیرا کے تخلیقی سفر کی دریافت کی صدی ہے۔ دیکھیں اب کتنی صدیوں بعد ناول اپنے آپ کو بدل کر نیا پیرہن زیب تن کرتا ہے۔

ضروری گزارش

الحمدللہ ماہنامہ ''ارژنگ'' اپنی مسلسل اشاعت کے سولہ برس مکمل کرنے والا ہے۔ ادبی جریدے کی اشاعت کا یہ طویل سفر آپ کی تخلیقات تعاون اور محبتوں کے سایہ سایہ ہی ممکن ہوا۔ گزشتہ چند برسوں سے ''ارژنگ'' کو مزید بہتر بنانے کے لیے ہم کوشاں رہے۔ اس میں ہمیں جو کامیابی ملی گزشتہ شماروں میں شائع ہونے والے خطوط اُس کی گواہی کے لیے کافی ہیں۔ 2015ء سے ہم اسے مزید بہتر بنانے کے لیے چند انقلابی اقدامات کر رہے ہیں۔ اس کی اشاعت انشاء اللہ دو ہزار ہوگی۔ دو ماہ کے اندر اشاعت کو یقینی بنایا جائے گا۔ نیز ملک اور بیرونِ ملک ادیبوں اور شاعروں کی زیادہ سے زیادہ نمائندگی کے لیے صفحات میں ضرورت کے مطابق اضافہ کیا جاتا رہے گا۔ اس سلسلے میں ہمیں آپ کی مفید آراء اور تجاویز کی ضرورت ہے۔ اُمید ہے آپ ہمیشہ کی طرح ہمارا ساتھ دیں گے۔ شکریہ

عامر بن علی (مدیرِ اعلیٰ)

حسن عباسی (مدیر)

ناز اوکاڑوی (مدیر پنجاب رنگ)

ماہنامہ ارژنگ

F-3 فیروز سنٹر غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور

nastalique786@gmail.com

پروین شاکر کے گھاؤ

ڈاکٹر سلیمان عبداللہ ڈار/گوجرانوالہ

یہ بات بلا خوف تردد کہی جا سکتی ہے کہ اُردو ادب میں پچھلی دو صدیوں کے دوران اُبھرنے والی سب سے توانا، دلیر، مؤثر بارعب غلط روایتوں کے سامنے ڈٹ جانے والی انکار بھری نسائی آواز پروین شاکر ہی کی ہے۔ دبستان دلی اور دبستان لکھنؤ میں عہد مغلیہ سے لے کر انگریز کے دور تک بعض خواتین شعراء کا کلام ہمارے سامنے تو آتا ہے جس میں بعض خواتین تو شاہی خاندان سے بھی تعلق رکھتی تھیں اور فارسی میں بڑے پائے کے اشعار کہتی رہی ہیں۔ مگر روایت سے بغاوت اور انا کے ساتھ انکار کی بات اردو ادب میں جس شدت اور پذیرائی کے ساتھ پروین نے کی ہے اس کی مثال ان سے پہلے ملنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔

وہ خوشبو کے آغاز میں اپنی اس جبلت اور سوچ کی عکاسی کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ بڑے سے بڑے انقلاب کی بنیاد اور شروعات بھی ایک انکار ہی سے ہوتی ہے۔ انہوں نے اس بات کی غمازی کرتے ہوئے مزید لکھا کہ سب سے پہلے انہوں نے کھوپے پہننے سے انکار کر دیا۔ میری اپنی ذاتی رائے میں شروع شروع میں تو دل پھینک پڑھنے والوں نے سوچا کہ ایک نوخیز خوبصورت دلکش لڑکی اگر میں زیر تو زبر والی بات کرتی ہے میں اس کو کیوں فون کروں۔ اس کو کیا معلوم نہیں کل موسم کی پہلی بارش تھی! والی خودداری سے لبریز محبت کا پیغام دیتی ہے۔ اپنی کاسمیٹکس چھوڑ کر اپنے محبوب کا پسندیدہ پرفیوم لے لیتی ہے۔ کمال ضبط کو آزماتی ہے اپنے ہاتھ سے اپنے محبوب کی دلہن سجا کر اسے دن کی روشنی سونپ کر خود اندھیروں کو لوٹ جانے والی بات کرتی ہے تو اس لڑکی کی شاعری کو تفنن طبع کے طور پر پڑھنا چاہیے۔ ہو سکتا ہے کچھ عرصہ تک نوجوانوں نے اس رومانوی شاعری کو صرف وقتی دل بستگی کا سامان ہی سمجھا ہو۔ مگر بعد ازاں وقت نے ثابت کیا کہ پروین کی سوچ کی گہرائی اور گیرائی ندرت خیال، ذہنی بلند پروازی، رومانوی شاعری سے کہیں آگے کی چیزیں ثابت ہوئیں۔ اُردو ادب کے ایک درخشندہ ستارے کی حیثیت حاصل کرنے میں پروین کو بہت تھوڑا انتظار کرنا پڑا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ پروین کی ذہنی آبیاری قلمی کو چنگ ادبی نکھار شعری فنی خوبیوں، زبان و بیان کے حسن اور خوبصورت بندش میں جناب احمد ندیم قاسمی مرحوم جیسے نابغہ روزگار اور استاد الاساتذہ شخصیت کا بہت بڑا ہاتھ تھا جنہیں وہ اپنی زبان میں عمر بھر ''عمو'' کہتی رہی ہیں۔ مگر زمانے نے خود بھی انھیں بہت کچھ سکھایا۔ ابتر گھریلو زندگی، خانگی ناچاقی، مسلسل اُکتاہٹیں، پریشانیاں ویسے بھی ہمارے ہاں ایک عورت کی زندگی کا حصہ رہی ہیں اور پھر پروین کو تو ان مسائل کا بدرجہ اتم سامنا کرنا پڑا۔ بلکہ کچھ عرصہ ایمرجنسی میں اُنھیں اپنی ایک سہیلی پروین قادر آغا کے گھر بھی رہنا پڑا جس کے اشارے اُن کی شاعری سے بھی ملتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کے لیے یا اُن جیسی خواتین کے لیے اپنے گھر میں شوہر کے ساتھ Sub Missive ہو کر رہنا شوہر کی منشاء کو پہچاننا اس کے قربانی دینا اور اس کی مان کر چلنا ایک کار دارد اور محال امر تھا۔ ویسے بھی اعلیٰ تعلیمی ڈگریوں کی پڑھائی میں کوئی پرچہ اس ضمن میں ممتحن نہیں ڈالتے کہ جس میں گھر کو بچانے کے بارے میں تحریک و تربیت دی جائے۔ ویسے بھی شاعر مرد ہو یا عورت اس کے خانگی حالات عموماً دگرگوں ہوتے ہیں۔ شاعر تو شاعر ہوتا ہے یا ہوتی ہے نہ وہ شوہر ہوتا ہے نہ وزیر اعظم اور یہ ضروری تو نہیں کہ ایک اوج کمال پر پہنچنے والی شاعرہ ایک اچھی بیوی بھی ہو۔ راقم کو یاد ہے کہ ایک بار ایف ایس سی کے دوران بہادر شاہ ظفر کی ایک غزل کی تشریح میں کلاس روم میں اُٹھ کر استاد مکرم سے سوال کیا ''بہادر شاہ ظفر ایک کامیاب حکمران ثابت کیوں نہ ہوئے؟'' تو جواب ملا کہ بہادر شاہ ظفر ایک شاعر تھے حکمران نہیں اور شاعری کا حکومت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ کیونکہ حکومت تو چند روز ہوتی ہے:

حسن اور حکومت سے کون جیت سکتا ہے
یہ بتاؤ دونوں کی عمر کتنی ہوتی ہے

اچھا لکھنے والی خواتین میں ادا جعفری، زہرا نگاہ، شبنم شکیل، فاطمہ حسن، یاسمین حمید، کشور ناہید اور ذوشی گیلانی کے علاوہ راقم کی کلاس فیلو ڈاکٹر غزالہ خاکوانی جیسی خوبصورت لکھنے والی اور گہری سوچ کی حامل شاعرات شامل ہیں۔ مگر ان میں پروین کا لہجہ جداگانہ ہے۔ اس لہجے کی شناسائی پذیرائی، مسیحائی اور انگڑائی اب تو ہر اُس جگہ پہنچ چکی ہے جہاں جہاں اردو بولی پڑھی لکھی اور سمجھی جاتی ہے۔ پروین کی رومانوی شاعری دوافتادلوں کے تار چھیڑنے والی ہے۔ جیسے:

ہم تو سمجھے تھے کہ اک زخم ہے بھر جائے گا
کیا خبر تھی کہ رگ جاں میں اُتر جائے گا
وہ جب آئے گا تو پھر اس کی رفاقت کے لیے
موسم گل مرے آنگن میں ٹھہر جائے گا
آخرش وہ بھی کہیں ریت پہ بیٹھی ہوگی
تیرا یہ پیار بھی دریا ہے اُتر جائے گا

پروین کا محبت بھرا دل زمانے کی اونچ نیچ،

حالات کے جبر، معاشی ناہمواریوں، غربتوں مجبوریوں، محکومیوں اور نارسائیوں کو دیکھ کر کڑھتا تھا۔ اس کی شاعری بلاشبہ خوبصورت جذبوں، خوبصورت دنوں، خوبصورت اداؤں اور محلاؤں کی شاعری ہے۔ مگر اُس نے زندگی کے متنوع موضوعات کو بھی نوک قلم کے سپرد کیا ہے جس کی مثالیں پروین کے کلام میں جابجا ملتی ہیں جیسے:

پابہ گل سب ہیں رہائی کی کرے تدبیر کون
دست بستہ شہر میں کھولے میری زنجیر کون
میرا سر حاضر ہے لیکن میرا منصف دیکھ لے
کر رہا ہے میری فردِ جرم کو تحریر کون
میری چادر تو چھنی تھی شام کی تنہائی میں
بے ردائی کو مری، پھر دے گیا تشہیر کون؟

پروین ساری عمر گئی رُتوں کے موسم اپنے نیم وا دریچوں سے دیکھتی رہی۔ وہ نرم لہجوں کی منتظر رہی۔ اس کی سماعتیں پھوار موسم کی متلاشی رہیں۔ کسی سرو قامت کے پیام کی راہ تکتی رہیں۔ چنار موسم کی آگ اس کی پور پور میں جلتی رہی۔ رفاقتیں اعتبار کو ترستی رہیں۔ وہ نئی بارشوں کی آرزو میں بھیگتی رہی۔ کوئے یار میں قدم رکھنے کو اس کی خوبصورت شخصیت ترستی رہی۔ وہ کہتی رہی کہ بیل کا ایک ہار اس کا سارا غرور پاش پاش کرسکتا ہے۔ مگر وہ جس کی دسترس میں تھی وہ اُسے اس کی رضا سے مانگنا چاہتا تھا۔ افسوس صد افسوس کہ اس کے ڈرائیور کی اک ذرا سی بے احتیاطی نے اس کی کار ٹرالے سے ٹکرادی۔ جس ڈاکٹر نے سب سے پہلے اس کے جسدِ خاکی کا معائنہ کیا راقم اُسے بھی ملا۔ مگر اردو ادب کا یہ درخشندہ ستارا مٹی کا لباس پہن کر سب کو رُلا گیا۔ پروین جیسے لوگ روز روز پیدا نہیں ہوتے مگر وہ جس مٹی میں مل جاتے ہیں وہ چاند ستاروں جیسے ان لوگوں کو اپنے دامن میں سمیٹ کر کہتی ہے کہ:

سچ پوچھئے تو زمیں آسماں ہے اب

پروین کا مزاج یہ تھا کہ جو بھی کہنا ہو بے دھڑک کہہ دو وہ سوچتی تھی کہ زندگی کی پریشانیوں سے گھبرانے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ تو ایک سمندر ہے اس کی گہرائی میں بھنور میں ہر دم زندگی ملے گی۔ اس کے کناروں کی طرف کیوں جائیں اس پہ اک وقت ایسا بھی گزرا تھا کہ ابھی اس کی شناسائی کی بات کو بہ کو نہ پھیلی تھی۔ وہ خود بتایا کرتی تھی کہ مقابلے کے امتحان میں معروضی پرمبنی چھوٹے سوالات میں ایک شعر درج کیا گیا تھا اور اس کے مصنف کا نام پوچھا گیا تھا۔ لطف کی بات یہ تھی کہ یہ شعر پروین ہی کا تھا۔ بعدازاں اسی مقابلے کے امتحان کے بعد انھیں سروس بھی ملی۔

پروین کا خیال تھا کہ بندہ ہرجائی تو ہے مگر وہ ایسا ہرجائی بن جائے کہ کہیں بھی جائے تو لوٹ کر اُسی کے پاس آئے تو اُسے ہرجائی نہ سمجھنے میں کوئی حرج نہیں۔ وہ جانتی تھی کہ بندہ ہرجائی ہے اور خدا ہمہ جائی ہے۔ بندہ خدا نہیں ہوسکتا اور نہ ہی بن سکتا ہے۔ اس لیے اُس سے بڑی بڑی وفاؤں اور قربانیوں کی توقع عبث ہے اور جب ایسا ہوگا تو شبِ تنہائی کی قیامت تو ضرور گزرے گی۔ اُسے فراق کی قدر تھی کیوں کہ اُسے وصال نصیب ہو چکا تھا۔ خوبصورت شعری صلاحیت ہی اُس کی خوبصورت شخصیت کی بنیاد تھی۔ اپنی رُلا دینے والی دکھ بھری یادوں کو پروین نے ریت پر لکھا۔ اس آس میں کہ اچھے دنوں کا کوئی جھونکا آئے اور ان یادوں کو اُڑا لے جائے اور پروین انھیں کبھی نہ پڑھ پائے۔ اُس نے اپنی خوبصورت یادوں کو انمٹ روشنائی سے دل کے ماربل پر لکھا تاکہ یہ تحریریں کبھی دھندلا نہ پائیں اور وہ انھیں روز روز پڑھتی رہے۔ اسی دوران اس نے اپنے بیتے دنوں کی تلخ یادوں کو دفن کرنے کا فن بھی سیکھا۔ وہ یہ سمجھتی تھی کہ اس نے جو چاہا وہ نہ ہوسکا۔ یہی زندگی کا حسن ہے۔ یہی ''ماہ تمام'' ہے اس کی رومانوی شاعری کی ''خوشبو'' جب دور دور تک پھیلی تو اس نے ''صد برگ'' کو صدا نہیں بنایا بلکہ اپنے لیے اپنے اشعار کے لیے ایک رواں دواں زندگی کی راہ چن لی۔ اس راستے پر آگے بڑھنے سے اس نے پھر ''انکار'' نہیں کیا۔ دنیا کا سب سے گہرا دریا دل کا دریا ہوتا ہے۔ وہ اس دریا کی موجوں سے لڑتی لڑتی اس کی تہہ میں اُتر کر زندگی کی حقیقت کو پانے میں کامیاب ہوگئی تھی۔ اس کی ہمت ایک پتنگ کی مانند تھی۔ اُس نے اسے اونچا اور اونچا اُڑنے دیا۔ وہ مخالفت میں چلنے والی آندھیوں سے پریشان نہ ہوئی۔ وہ جان چکی تھی کہ جب بھی ہمارا کسی سے ٹکراؤ ہوگا تو ہم ضرور کچھ نہ کچھ سیکھیں گے۔ زمانے اور روایات کے ساتھ ٹکراؤ میں پروین نے جینے اور زندہ جاوید رہنے کا اسلوب سیکھ لیا تھا۔

افسوس صد افسوس کہ پروین کے ڈرائیور کی غفلت سے اُن کی گاڑی ایک ٹرالر سے ٹکرا گئی۔ جس ڈاکٹر نے پروین کو ایمرجنسی اور جان کنی کے عالم میں چیک کیا میں اُسے بھی ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے نہیں ایک پرستار کی حیثیت سے ملا۔ یقیناً وہ پل بڑے ہی جاں گسل تھے۔ کون کہتا ہے کہ پروین کی عمر بہت تھوڑی سی تھی۔ جب روح چل بسی وہ رات جو اس نے سڑک سے ہسپتال تک موت و حیات کی کشمکش اور کرب میں گزاری وہی اک رات سو برس سے طویل تھی۔ اس کی حیات جو اَب حیات جاوداں ہے میں بھی بہت سی ایسی راتیں تھیں جو اُس نے پروین قادر آغا کے گھر گزاریں۔ راہی ملکِ عدم ہوتے ہوئے وہ اپنے پیچھے جو غیر مطبوعہ غزلیں نظمیں چھوڑ گئی انھیں اس کی ہمشیرہ نسرین اور جناب امجد اسلام امجد نے محترمہ پروین قادر آغا کے ساتھ مل کر اور جناب مظہر الاسلام کے ساتھ ساتھ جناب توصیف تبسم کے شبانہ اور محنت سے ''کفِ آئینہ'' کے نام طبع کرایا۔ پروین شاکر ٹرسٹ بھی اس سلسلے میں فعال رہا۔ بہرحال اس میں کوئی شک نہیں کہ نسائیت کا جو خوبصورت لہجہ پروین نے اردو شاعری کو عطا کیا اُسے صدیوں اُردو ادب کا قاری فراموش نہیں کر سکے گا۔

"جاں ستاں" از حلیم قریشی

حمیدہ شاہین/لاہور

قلم کی نوک پہ دل سے جو خوں اُترتا ہے
زمانہ چاہیے اُس کو ہنر بناتے ہوئے

یہ شعر حلیم قریشی کا ہے جو اپنی کتاب "جاں ستاں" کے آغاز میں لکھتے ہیں:

"اس میں کوئی شک نہیں کہ شاعری ہماری زندگی کو زرخیز بناتی ہے اور ہمارے لیے ذہنی آسودگی کا سامان مہیا کرتی ہے لیکن اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ یہ ہمارے تہذیبی ارتقا کے عمل کو متحرک رکھنے کے لیے ہماری معاون ثابت ہوتی ہے۔"

یہی وہ نقطہ نظر ہے جسے رابطے کی کڑی یا پل کہا جا سکتا ہے۔ یہ طرزِ احساس انسان کو جڑوں سے کٹنے نہیں دیتا اور روایت سے اس کا رشتہ استوار کیے رکھتا ہے۔ حلیم قریشی کی شاعری میں روایت کی گہری خوشبو اسی گل فکر سے پھوٹی ہے لیکن درایت سے قطعی گریز بلکہ پرہیز کا معاملہ بھی نہیں ہے۔

روایت سے کلی انقطاع کے لیے جو قاتلانہ دلیری درکار ہوتی ہے اس میں پہلا رسک تو "بے راہ روی" کا ہوتا ہے۔ ضروری نہیں کہ ہر نیا راستہ سیدھا راستہ بھی ہو۔ اگر وہ کسی کھائی پر ختم ہو تو پلٹنے یا کھائی میں کود جانے کی آپشن ہی رہ جاتی ہے لیکن روایت بھی کوئی سرخ قالین نہیں ہے جو پیچھے آنے والوں کے لیے بچھتا چلا جاتا ہو۔ زمانے کی چھلانگوں سے Skiping کا عمل در آتا ہے۔ کہیں کوئی منطقہ گم بھی ہو جاتا ہے، کہیں رخنہ پڑ جاتا ہے۔ فطرت اس کا بندوبست اسی طریقے سے کرتی ہے کہ ہر دور میں ایسے تخلیق کار پیدا ہوتے ہیں جن میں سے کچھ تو گم شدہ منطقوں کی بازیافت کرتے ہیں اور کچھ رخنے پُر کرنے کا بیڑا اُٹھاتے ہیں۔ حلیم قریشی مجھے اسی دوسرے قبیلے کے فرد لگتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

اپنی مٹتی ہوئی اقدار کی خوشبو کے لیے
باغِ ماضی میں چلے جاتے ہیں آبا کی طرف

روایت کے رخنے اتنے چھوٹے بھی نہیں ہوتے کہ کسی ایک فرد کی مساعی سے پُر ہو سکیں۔ ہر کوئی اپنی ہمت اور وسعت کے مطابق حصہ ڈالتا ہے۔ کنٹری بیوٹر کی اصل کامیابی یہ ہے کہ وہ جہاں اپنا حصہ ڈالے وہ مقام اور اس کا حصہ جگمگاتا رہے۔ اس معاملے میں حلیم قریشی خود کیا کہتے ہیں:

میری میراث میرا ریختہ ہے
یہی دو لفظ ہیں جاگیر اپنی
سرِ مقتل ذرا سج کر میں جاؤں
اُٹھانے دو مجھے زنجیر اپنی
حلیم اس کو یہ اپنا غم لگے گا
کہانی جب سنے گا میر اپنی

اسی تسلسل کی دوسری غزل میں کہتے ہیں

کہاں پر ڈھونڈیے تقدیر اپنی
فسانہ ہے ابھی تعمیر اپنی

اس مطلع کا مداوا انہوں نے اسی غزل میں کر دیا ہے:

جنھیں تدبیر سے بھی واسطہ ہو
بناتے ہیں وہی تقدیر اپنی

اس تدبیر بلکہ حسنِ تدبیر کی جھلکیاں بھی اسی مجموعہ کلام میں موجود ہیں جنھیں ہم جدت کا کھردرا نام دینے کے بجائے روایت کو تازہ کرنے کا عمل کہیں تو زیادہ مناسب ہوگا۔ جدت فی نفسہٖ کسی کھردرے پن کا نام نہیں ہے لیکن اس وقت شاعری میں نامانوس نئی لفظیات کو جگہ بے جگہ استعمال کرنے کا نام جدت رکھا جا رہا ہے۔ یہ عمل جب تک پوری تلازمہ کاری کے ساتھ مکمل نہ ہو، ہمیں ایک بے ڈھب، کھردرے پن کے ساتھ کچھ نہیں دیتا۔ شاعری میں جدت چیزے دیگر جس کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں۔ فی الحال حلیم قریشی کی شاعری پر واپس آتے ہیں۔ کہتے ہیں:

تو بھی مصروف ہے، میں بھی ہوں ذرا عجلت میں
مل کے بیٹھیں گے مری جان کبھی فرصت میں

پہلے مصرع میں گلوبلائزیشن کے نتیجے میں پیدا ہونے والی مصروفیتوں اور عجلتوں کا بیان ہے جو عصرِ حاضر کا تجربہ ہے۔ اس نئے تجربے کے بیان نے دوسرے مصرع کے روایتی مضمون کو تر و تازہ کر

دیا ہے۔ اسی قبیل کا ایک اور شعر ملاحظہ ہو:

اہلِ ہوس کو خاک نشینوں کا خوف ہے
تنکا کہاں گیا ہے بگولے میں بیٹھ کر

یہاں دوسرے مصرع نے جو اسرار تخلیق کیا ہے وہ قاری کو وہی لطف سخن مہیا کرتا ہے جس کی خاطر وہ شاعری کا رُخ کرتا ہے۔

تازہ کاری کا معاملہ بھی عجیب ہے۔ اوّلاً تو تازہ کاری دو ہی چیزوں کا نام ہے۔

(۱) کسی نئے نکور، ان چھوئے تجربے کا بیان
(۲) پرانے تجربے کا نیا نکور بیان

ان دونوں کاموں میں وہی تخلیق کار کامیاب ہوتا ہے جس کی سوچ میں کھلی کھڑکیاں اور وا دروازے ہوں لیکن زیادہ تر ہمیں ایک تیسری صورت دکھائی دیتی ہے کہ ذرا سا پردہ سرکانے سے تازہ ہوا کا چھوٹا سا جھونکا شعری فضا میں داخل ہو جاتا ہے۔ لیکن بات وہی ہے کہ کھڑکی پوری کھولنی ہو یا ذرا سا پردہ سرکانا ہو، روایت کی قدیم اور آرام دہ کرسی سے اُٹھ کر کھڑکی تک آنا تو پڑتا ہے۔ اگرچہ شاعری، خصوصاً غزل ایک ایسی عجیب شے ہے کہ کسی بھی رنگ میں آئے اپنا قاری، اپنا سامع اور اپنا جادو تلاش کر ہی لیتی ہے۔ ابھی جو میں نے لطف سخن کی بات کی تھی تو دو شعر اور سن لیجیے:

چمن کا حسن تھا اپنا کسی دلبر سے پہلے بھی
یہاں اک اور منظر تھا ترے منظر سے پہلے بھی

....

کرے کی تپش جسم کو پہنچی تو یہ سمجھے
رکھا ہے کسی طاق پہ دیوان ہمارا

حلیم قریشی نے الفاظ کی تکرار سے بھی شعری جمال تخلیق کیا ہے۔ جس کی مثال میں دو غزلیں خاص طور پر پڑھی جا سکتی ہیں۔ ایک کی ردیف ہے ''صبر کرو'' اور دوسری غزل کی ردیف ہے ''ڈھارس دے دی''

اس کتاب میں غزلوں کے ساتھ ساتھ چھوٹی چھوٹی نظموں کے نگینے بھی جڑے ہیں۔ مجھے جو نظم سب سے زیادہ اچھی لگی اس میں آپ کو شریک کرتی ہوں۔ نظم کا عنوان ہے ''مزاحمت''

خاموشی
جیب میں رکھے ہوئے
چاقو کی طرح
اور گفتار
کسی چپ کی سیہ چادر میں
یا کسی
کانچ کی قینچی کی طرح
جو کسی پھول کی پتی کو
کترتے ہوئے
ٹکڑے ہو جائے

دراصل نظامِ شعر بھی نظامِ زیست کی طرح ہوتا ہے۔ جس طرح ہم سب کا نظامِ زیست ہزار مماثلتوں کے باوجود ہر ایک میں مختلف ہے، اسی طرح نظامِ شعر بھی ہیں مختلف، کہیں منفرد، کہیں تازہ اور کہیں بالکل نیا ہوتا ہے۔ ہم اسی ترتیب کو نظامِ شعر کا ارتقائی سفر بھی کہہ سکتے ہیں۔ حلیم قریشی کے ارتقائی سفر کی ایک جھلک دیکھیے:

اک آب جو کہ مرے گاؤں سے گزرتی تھی
کسی پہاڑ میں وہ جھیل ہونے والی ہے

مجھے یہ پوری غزل ہی اچھی لگی۔ خاص طور پر اس کا مطلع موجودہ دہشت گردی کی بارودی و آتش زدہ صورتِ حال کے تناظر میں رکھ کر دیکھیے:

ہوا جو آگ میں تبدیل ہونے والی ہے
کسی کے حکم کی تعمیل ہونے والی ہے

یہ خالصتاً اس دور کا شعر ہے۔ قدیم انسان کو ہوا کی حدت کا تجربہ فقط موسم کی شدت کے حوالے سے تھا لیکن ہوا کا یک بیک آگ میں تبدیل ہو جانا نئے آدمی کا مشاہدہ و تجربہ ہے۔ کیونکہ اب کسی کو عالم بساطِ سیاست پر مہرے پیٹنے ہوں، کسی کو دنیا کا نقشہ تبدیل کرنا ہو یا کسی کو جنت کی تلاش ہو، سب کو اپنے مسائل کا حل بم بلاسٹ اور ڈرون حملوں میں نظر آتا ہے۔ آگ میں تبدیل ہوتی اس ہوا میں سانس لینا ہم سب کی مجبوری ہے۔ ایسے میں تخلیقی فنون، خصوصاً شعر و ادب سے جو آکسیجن ملتی ہے وہ غنیمت ہے۔ سانسیں آسان کرنے والوں کی خیر ہو اور شعر و ادب کے ذریعے آکسیجن کی ترسیل کرنے والے سلامت رہیں۔

نامور شعراء کے کلام پر مشتمل فیصل آباد میں مقیم شاعرہ
شمیم ظفر رانا کا انتخاب

صرف تیرے لیے

شائع ہو گیا ہے

ملنے کا پتہ:
شمع بک ایجنسی، بھوانہ بازار، فیصل آباد

محبت اک سمندر ہے

رقیہ غزل/لاہور

پاکستان کی سرزمین ادب کی زرخیزی سے انحراف ممکن نہیں۔ ہمارے ادباء اور قلم کاروں نے اپنی تخلیقات کی شکل میں وہ گل لالہ پیدا کیے کہ جن کی مہک سے آج اُردو ادب کا گوشہ گوشہ معطر ہے۔ روز افزوں ان اصناف میں جدت اور نت نئے تجربات کی وجہ سے اُردو ادب ایک بحر بیکراں کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ انہی اصناف سخن میں ایک صنف ''آزاد نظم'' ہے۔ جو کہ انگریزی ادب کی وساطت سے وجود میں آئی ہے۔ بیسویں صدی کے اوائل میں انگریزی ادب کے رجحان کی وجہ سے ایک نئی صنف متعارف ہوئی جسے Blank Verse نظم معریٰ کہتے ہیں۔ جس میں وزن اور بحر کی پابندی کی جاتی تھی مگر قافیے کو نظر انداز کر دیا جاتا تھا۔ اس کے بعد اُردو شاعری میں آزاد نظم کا رواج عام ہوا جبکہ اس میں بھی بحر اور وزن کی قید ہوتی ہے مگر قافیہ کی نہیں۔ آزاد نظم اور نظم معریٰ میں فرق یہ ہے کہ آزاد نظم کے ارکان کو شاعر اپنی مرضی سے توڑ سکتا ہے اور مصرعوں کی ترتیب بھی چھوٹی بڑی کی جا سکتی ہے مگر نظم معریٰ میں یہ سب کچھ اس طرح ممکن نہیں ہوتا۔ نظم معریٰ کو زیادہ پذیرائی نہ مل سکی جبکہ آزاد نظم ایک باقاعدہ صنف اُردو ادب کی شاعری کا اہم جزو قرار پائی۔

آج ایسا کوئی معروف شاعر کرۂ ارض پر موجود نہیں جس نے آزاد نظم میں طبع آزمائی نہ کی ہو۔

آزاد نظم بلاشبہ حدود و قیود سے آزاد ہوتی ہے۔ اس میں ایک ہی خیال کو خاص بہاؤ کے ساتھ پیش کیا جا سکتا ہے۔ یہ شاعر کو وسیع کینوس مہیا کرتی ہے جس میں وہ اس کا تخیل ارتکاز کے ساتھ تفصیل سے بیان ہوتا ہے۔ غزل میں انسان سرابوں میں بھٹکتا ہے۔ جبکہ نظم انسان کو حقیقی دنیا کی تصویر فراہم کرتی ہے۔

آزاد نظم تمام اصناف ادب سے زیادہ اہم ہے۔ آج کل آزاد نظم کو پھر عروج حاصل ہے۔ ایسی ہی ایک آزاد نظموں کا ایک شعری مجموعہ ''محبت اک سمندر ہے'' میرے مطالعہ میں آیا ہے۔ اس کے مصنف جناب ارشد ملک صاحب ہیں جو کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ گزشتہ بیس برس سے شعر و سخن کی دنیا سے وابستہ یہ درویش منش لکھاری اپنے سرد لب و لہجے اور دلکش انداز بیاں کی وجہ سے ادبی حلقوں میں نمایاں اہمیت کا حامل ہے۔ کوئی ادبی سرگرمی ایسی نہیں جس میں رونق محفل نہیں ہوتے اور اپنے مسحور کن کلام سے حاضرین کی توجہ کا مرکز نہیں بنتے۔

جب ارشد ملک کی پہلی کتاب ''دل درد کا ٹکڑا ہے'' 1995ء میں منظر عام پر آئی جو کہ غزلیات اور آزاد نظموں پر مشتمل تھی پھر یکے بعد دیگرے ان کی مختلف تخلیقات نے اپنے جداگانہ انداز بیان و تحریر کی وجہ سے اپنے ہم عصر شعراء میں بے انتہا مقبولیت اور نمایاں مقام حاصل کر لیا۔

ارشد ملک صاحب کا فنی سفر طویل ہی نہیں بلکہ ادبی خدمت سر انجام دینے کے اعزازات سے بھی مالا مال ہے۔ انہوں نے منتخب شعری کلام کے قریباً 24 انتخاب ترتیب دیے جو طبع شدہ ہیں اور جن کے انتہائی معیار سے ہم سب بخوبی آگاہ ہیں۔ اس کے علاوہ آپ کئی ادبی تنظیموں اور ادبی رسائل کے ساتھ بھی ایک مدت سے منسلک ہیں۔

میرے خیال میں......شاعر گویا مصور ہے جو کہ معنی کی تصویر دل پر کھینچتا ہے اور بسا اوقات اپنی رنگینی فصاحت سے نقش کو اصل سے بھی زیادہ زیبا بنا کر دل کی آنکھ سے دکھا دیتا ہے۔ وہ اشیاء جن کی تصویر ایک مصور سے نہ کھنچ سکے یہ اعجاز نطق سے ہتھیلی پہ سرسوں جما دیتا ہے۔

کہنا بجا ہوگا کہ ارشد ملک کا قلم الفاظ تراشی کے ساتھ ساتھ منظر کشی بھی کرتا ہے جس کو پڑھ کر کردار پردۂ بصارت پر جھوم اُٹھتے ہیں۔ ملاحظہ ہوں:

اے چاندی لڑکی
تم کہہ رہی تھی ناں!
تمہیں مجھ سے محبت ہو نہیں سکتی
مانا کہ یہ سچ ہے
مگر اے چاندی لڑکی
مجھے اتنا بتاؤ تم

کہ جب موسم بدلتے ہیں
دن میں رنگ بھرتے ہیں
پرندے چہچہاتے ہیں، سریلے گیت گاتے ہیں
کیوں تم مضطرب ہو کر
اکیلے پن سے گھبرا کر
ان کو راز دیتی ہو
مجھے آواز دیتی ہو
مگر اے چاند سی لڑکی
مجھے دعویٰ ہے چاہت میں
کبھی نفرت نہیں ہوتی
محبت جاگ جاتی ہے

ہجر و وصال کی اُلجھنوں میں، کشمکش زمانہ کی بے ثباتیوں کی کٹھن شاہراؤں پر دوڑتی بل کھاتی یہ نظمیں آپ کی آنکھوں میں ان تمام لمحات اور مناظر کو زندہ کر دیتی ہیں جو دو جوان دلوں کی اُمنگوں اور ان کے شیشے جیسے سپنوں کا دل خراش بیان ہوا کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

''مرے بچھڑے ہوئے ساتھی'' سے
اے بچھڑے ہوئے ساتھی
اس کاروبارِ دنیا میں
بہت مصروف رہتا ہوں
تھک ہار کر جب یاد کا بستر بچھاتا ہوں
میرے لمس کے موسم مرے اندر مہکتے ہیں
میں ان مہکے ہوئے لمحوں کے سائے میں
گرداب عمر کا کاغذ اُٹھاتا ہوں
ہر اک چیز کو وحشت خانے میں
گرا کر بس میں آرام لکھتا ہوں
تمہارا نام لکھتا ہوں
میرے بچھڑے ہوئے ساتھی

جانِ جاناں کے دلکش اور پرلطف بیانات سے ادب آج بھی جگمگا رہا ہے کوئی فن پارہ حسن جاناں کی تعریف کے بن ادھورا ہے۔

اک چاند دیکھا تھا
اس تیکھے مصور کا
حسیں شاہکار تھی وہ
اس کے خدوخال ایسے تھے
کہ جیسے آسمان کے طشت پر رکھے ہوئے تارے
کہ وہ استعارے
مل نہیں سکتے کسی صورت
وہ ایسی جل پری تھی
میں نے جس کے سامنے ہر اپسرا کو ماند دیکھا تھا

رفاقت بلاشبہ ہر پیار کرنے والے دل کا مقدر ہوا کرتی ہے اور محبت ہر دل کی ہمیشہ رفاقت نہیں رہتی۔ اس جذبے کا دلفریب بیان جناب ارشد ملک کی اس نظم ''اسے کہیں سے ڈھونڈ لاؤ'' سے بخوبی عیاں ہے۔

بتا تو دیتے
کیوں بچھڑنے لگے ہو ہم سے
نبھانا محال تھا تو ہمیں بتاتے
مگر اب بچھڑنا ٹھہر گیا ہے
عروج آئے گا فرقتوں پر
محبتوں کو زوال ہوگا
ہر اک لمحہ وبال ہوگا
بتا تو دیتے

جناب ارشد ملک ایک ایسے دل کے مالک ہیں جو آج بھی ان خوابوں میں زندہ ہے۔ جو کسی خواب زادی کے حسین وجود سے مہکتے ہیں اور اس کے ملن کی اُمید و یاس میں کبھی کمی نہیں ہوتی۔ جیسے

''محبت اک سمندر ہے''
محبت وہ کہانی ہے
جتنا بھی کوئی بھولے
یہ یاد رہتی ہے
محبت اک سمندر ہے
جتنا بھی کوئی ڈوبے
کنارے پر ہی رہتا ہے
محبت اک سمندر ہے

ان کی آنکھیں آج بھی ان راہوں کی خاک چھانتی ہیں جن پر کبھی وہ ہم قدم چلا کرتے تھے۔ عمر کے زیر و بم اور حوادثات زمانہ نے اس کے جذبۂ اُلفت کو مدھم نہیں کیا۔ بلکہ اس کی تپش سے آج بھی اس کے الفاظ سوزاں ہیں۔ جیسے

چلو اب لوٹ آؤ ناں
یہ تم نے کہا تھا ناں!
مجھے جذبِ محبت سے کبھی جو تم پکارو گے
میں اس دن لوٹ آؤں گا
دیکھو ناں!
کئی لمحوں، کئی سالوں، کئی صدیوں سے
تیرا راستہ تکتی میری منتظر آنکھیں
میرے دل کی یہ دھڑکن اور سانسیں
بس تمہارا نام لیتی ہیں
اور ان کی تکمیل پاتی چاہتوں کو یوں
توڑا تو نہیں کرتے
خوشیوں سے بھری شاخوں کو یوں

توڑا تو نہیں کرتے
تمہیں معلوم ہے آنکھیں تمہاری راہ تکتی ہیں
مجھے یوں آزماؤ، ناں
چلو اب لوٹ آؤ ناں

ارشد ملک صاحب جہاں خوابوں کی دنیا کا باسی معلوم ہوتا ہیں وہیں اس کا دل کڑھتا ہے معاشرتی حالات پر...... کیونکہ کوئی بھی ادیب معاشرتی بے ثباتیوں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا اور ادیب اپنے معاشرے سے باطنی طور پر مربوط ہو تو ادب پر اس کی شخصیت کے گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ جیسے:

''بستی''

ہاں کچھ روز پہلے تک یہ اک سرشار بستی تھی
یہاں ہر گام کومل زندگی رقص کرتی تھی
یہاں رنگوں میں بھیگے شوخ موسم کا بسیرا تھا
یہاں ہر سو چمن آباد تھا خوشبو کا ڈیرا تھا
پھر اس پر جو ٹھہری بلائے ناگہانی تھی
ظلم کے سرد ہاتھوں نے رقم اندھی کہانی کی
بدل کے جس نے رکھ دی پل میں
منطق زندگانی تھی

جناب ارشد ملک کی تمام نظمیں خوبصورت مفاہیم اور درد سے سرشار ہیں۔

جناب ارشد ملک کا فنی سفر اپنی پوری آب و تاب سے جاری و ساری ہے اور جو کہ اپنے ہم عصر شعراء کرام میں انھیں نمایاں مقام دلانے میں سنگ میل ثابت ہوگا۔ کیونکہ مسلسل محنت و مشقت ہی تابناک مستقبل کی ضمانت ہوا کرتی ہے۔

اس پوری کتاب ''محبت اک سمندر ہے'' میں ایک زیست مکمل طور پر بند ہے۔ جو خدائے بزرگ و برتر کے سامنے سجدہ ریز ہونے سے لے کر ماں کی ممتاز کے بے مثال اظہار سے ہوتی ہوئی ایک خواب زادی کے ساتھ گزارے دلکش، پر کیف لمحوں کی یادوں سے اُلجھے ہوئے اور ماضی کی گم گشتہ وادیوں میں گھومتے ایک ایسے انسان کی کتھا ہے جو آخر کار جھک جاتا ہے۔

جناب ارشد ملک کی کتاب پر میری یہ تحریر ان کی ادبی کائنات کو سر کرنے کی ادنیٰ سی کاوش ہے۔ ان کے طویل فنی سفر کا احاطہ کرنا ناممکن اور اس تک رسائی بھی مشکل ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کوئی تحریر حرف آخر نہیں ہوتی اور نہ ہی کسی کی رائے ایسی حتمی ہو سکتی ہے کہ اس پر بحث کرتے ہوئے اختلاف رائے سے کام نہ لیا جا سکے۔ کیونکہ علم و بحر بے کراں ہے کہ اس کا احاطہ ناممکن ہے۔ جناب ارشد ملک کے کلام کو علمی، ادبی اور ٹیکنیکل طور پر معیاری قرار دینا ہر لکھاری کی مجبوری ہے۔

ان کے لیے نیک خواہشات اور دُعائیں
خدا کرے زورِ قلم اور زیادہ

ڈونگا بونگا میں مقیم معروف شاعر
خلیل احمد کا شعری مجموعہ
تنہا چھوڑ دیا
عنقریب شائع ہو رہا ہے

میں اکیلا ہی نہیں جا رہا ہوں بستی سے
یہ روشنی بھی مرے ساتھ جانے والی ہے
شیخوپورہ میں مقیم جدید لہجے کے توانا شاعر
اظہر عباس کا تازہ شعری مجموعہ
''اسی دشت میں''
شائع ہو گیا ہے
ملنے کا پتہ
انحراف پبلی کیشنز، لاہور/ اسلام آباد
0333-6509204

دہلی (انڈیا) میں مقیم نامور افسانہ نویس
پرویز شہریار کے افسانوں کا مجموعہ
''شجر ممنوعہ کی چاہ میں''
شائع ہو گیا ہے
صفحات 150 قیمت 200 روپے
ملنے کا پتہ
ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی (انڈیا)

پہلا گیت محبت کا

نازاوکاڑوی/اوکاڑا

''پہلا گیت محبت کا'' مجموعہ دیکھتے ہی پیانو اور گٹار کی لے کے ساتھ ہی من اپنے آپ گنگنانے لگا۔ پہاڑوں سے گرتی ہوئی آبشاروں کا مترنم شور کسی سرسبز و شاداب وادی میں کھلے ہوئے پھولوں کی خوشبو اور پھل دار درختوں سے اٹھتی ہوئی مہک جہاں سانسوں کو مہکا رہی تھی تو وادیوں میں بہتے ہوئے جھرنے لے کے ساتھ لے ملا کر محبت کے گیت کی دھن میں شامل ہو کر ''پہلا گیت محبت کا'' میں اپنا حصہ ڈال رہے تھے۔ سرورق کو بنانے میں عبید صاحب کے فن کو داد نہ دینا زیادتی ہوگی اور حسن انتخاب کی داد کا بھی حسن عباسی مستحق ہے۔ جس کی باریک بیں نگاہیں ان کے ذوق کی عکاسی کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ کتاب کھولتے ہی جب اندرونی صفحات پر نظر پڑتی ہے تو اوراق پر سرورق والی گراؤنڈ اوراق پر چھپی ہوئی شاعری کے مزے کو دو چند کر دیتی ہے۔ تن دیپ تمنا نے الفاظ کو اپنی قلبی واردات کو شاعری کا جامہ پہنا کر کسی نو بیاہتا دلہن کے عروسی لباس کی طرح جگمگا دیا ہے۔ دیکھنے والے لباس اور دلہن دونوں کو دیکھ کر عش عش کرنے پہ مجبور۔

محبت! محبت ہی وجہ تخلیق قرار دی گئی ہے۔ پہلی محبت خود خدا نے اپنے محبوب سے کی۔ اسی محبوب کے لیے بشر کی تخلیق ہوتی ہے۔ لباس بشریت میں حضرت آدم علیہ السلام تشریف لائے اور ان کی دل بستگی کے لیے اماں حوا کا وجود سامنے آیا۔ یوں پہلی بار حضرت آدم نے حوا کے لیے پہلا گیت محبت کا گایا۔ یہ روایت ہم تک پہنچی تو ہم نے بھی جی بھر کے محبت کے گیت گائے اور گاتے جا رہے ہیں، گاتے گاتے جاتے رہیں گے۔ تن دیپ تمنا کے سینے میں بھی دل ہے اور دل میں محبت بھی۔ تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ تن دیپ تمنا محبت کا گیت نہ گائے۔ یہ الگ بات کہ تن دیپ نے تن کے دیے جلا کر اپنی تمناؤں کو روشن کیا ہے۔

تن دیپ تمنا کی غیر عروضی نظموں میں بلا کے مضامین ہیں۔ کلام میں بھرپور چاشنی ہے تو الفاظ میں ترنم یا موسیقت ہے۔ تن دیپ تمنا نے اپنی حسرتوں کو مشرقی تہذیب و روایت میں رچے ہوئے نثری نظموں کے سانچے میں ڈھال کر ادب کے قارئین کو نہ صرف نئے نئے ذائقے سے روشناس کرایا بلکہ اپنے کومل جذبات کا اظہار بڑی خود اعتمادی کے ساتھ کیا ہے۔ تن دیپ کے سیدھے سادے الفاظ، تراکیب، نرم ملائم سجاؤ کسی الائچی کے باغات کی خوشبو کی طرح مشامِ دل و جاں کو معطر کیے جاتے ہیں۔ آج کے دور کا انسان اپنے دکھی جذبات کے اظہار کے لیے اپنے کسی رازدار، قابل اعتماد دوست کا کاندھا چاہتا ہے۔ جہاں اپنا سر رکھ کر اپنے کرب کو آنسوؤں کی شکل انڈیل سکے لیکن تن دیپ تمنا نے بغیر کسی کا کاندھا لیے اپنے اندر کا اُبال انہی صفحات کو اپنا ہم راز جانتے ہوئے ان پر انڈیل دیا ہے۔ یہی انداز ان کی خود اعتمادی کا غماز ہے۔ اپنی ایک نظم ''تم کہیں بھی نہیں گئے ہو'' میں اپنے جذبات و احساسات کو لفظوں میں پرو کر مالا بناتے ہوئے کہتی ہیں:

تم کہیں بھی نہیں گئے ہو، یہیں تو ہو......
میرے کمرے میں پھیلی
وسعت صحرا کی تنہائی میں
حسرت زدہ حصار خاموشی میں......
انہیں پردوں کے پیچھے چھپ کر
مجھے نظمیں لکھتے دیکھ کر مسکراتے......سر کو ہلاتے
کبھی کبھی تم خفا بھی تو ہوتے ہوگے
بار بار بتی جلانے سے
تم یہیں کہیں ہو

یہ چند سطریں پوری نظم کا احاطہ کیے نظر آ رہی ہیں۔ پڑھتے ہوئے خود کو بھی اس ماحول کا حصہ معلوم ہوتا ہے۔ نظم میں تنہائی کا درد بھی ہے اور محبوب کی خیالی اور ذہنی موجودگی کا احساس بھی اور کہہ اٹھتی ہے ''تم یہیں کہیں ہو......''

روز ازل سے ہی ماں کی ممتا بھی ساتھ ساتھ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ماں کے اندر کیا بلا غرض و غایت جذبات بھر دیے ہیں۔ سراپا محبت کی تصویر،

اولاد کے لیے جاں سے بھی گزر جانے کی تڑپ۔ کہیں گیلی جگہ کو سکھاتی ہوئی تو کہیں کڑی دھوپ میں آنچل بچھاتی ہوئی۔ کہیں بھوک کو مٹاتی خود بھوکی بچوں کی پریشانی میں خود اذیت کا شکار ہوتی ماں صرف ماں۔ جہاں بھی تن دیپ نے ماں کے جذبات کے احساسات کو بھی نئے پیرہن پہنائے ہیں قابل دید اور شنید ہیں۔ دیکھئے نظم ''ماں اکثر کہتی ہے''

ماں اکثر کہتی ہے......
آدھی رات تک
پڑھتی لکھتی رہتی ہو
آنکھیں پتھر ہو جاتی ہیں
پھر کہتی ہو نیند نہیں آتی......

پڑھتے جائیں تو ''پہلا گیت محبت کا'' لمبا ہوا جاتا ہے۔ اس کی دُھن بھی اس قدر خوش کن کہ سننے میں مگن پتہ ہی نہیں چلتا۔ ایک چھوٹی مگر پراثر نظم ''سمندر کنارے بیٹھ کر'' اب یہاں تن دیپ کتنی معصوم نظر آتی ہیں یا تو سب کچھ جانتے ہوئے بھی انجان رہنا چاہتی ہے وہ بھی کبھی محب، محبوب کی نازک طبع کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے اُسے اس کی بے اعتنائی جتانا نہیں چاہتا یا پھر دل گرفتہ ہو کر پوچھ رہی ہے۔ سمندر کنارے بیٹھ کر......

سمندر کنارے بیٹھ کر
میں یہ اکثر سوچا کرتی ہوں
اس جہاں میں کہیں اور بھی ہے
جو ترستا ہے تڑپتا ہے
ہم سفر کے لیے

میں تو بس اتنا چاہوں
وہ کہے
میں تو بس اتنا چاہوں
آپ چاہیں مجھے......
میں شرارت سے پوچھوں
کسے چاہوں
مر مر کر
ڈر ڈر کر
ٹوٹ ٹوٹ کر
یا پھر تنکا تنکا......ذرا ذرا......؟

آپ اندازہ کریں اس شرارت میں کتنی یاسیت ہے۔ بلکہ لبالب بھری ہوئی ہے۔ محبوب کی بے وفائی کا گلہ بھی ہے اپنی بیچارگی کا احساس بھی۔ جدائی کے درد کا ادراک بھی اور فیصلہ بھی محبوب کے ہاتھ۔ چارہ تو ہر حالت میں ہے لیکن میرے محبوب تیرا کہا ہوا ہر لفظ میرے لیے حکم کا درجہ رکھتا ہے۔ آپ ہی بتا دیں۔ چاہیں آپ کو مر مر کر، ڈر ڈر کر، ٹوٹ ٹوٹ کر یا پھر تنکا تنکا، ذرا ذرا۔

جیسے کوئی متاعِ حیات لٹ جانے کے بعد تہی دست ہو کر دُنیا و مافیہا سے بے خبر اپنی ہی دنیا میں حسرت و یاس کی تصویر بنے سراپا انتظار کا مجسمہ بن چکا ہو۔ ایسے میں بادِ بہاراں کے جھونکے اُس مجسمہ میں نئی روح پھونک کر زندہ کر دے۔ اس کی حسرتیں، اُمیدیں حقیقت کا رُوپ دھار لیں تو کیف و سرمستی کا وہ عالم وہی جان سکتا ہے جو خود اس حقیقت سے گزرا یا وہ درد اُس نے سہا ہو۔ یہی کیفیت کی غمازی اس نظم میں ملتی ہے۔

تم آئے تو......
کسی نے میری ہتھیلیوں سے
رنگِ حنا چرا لیا تھا
میرے قدم لڑکھڑا رہے تھے
اور میں روح کے لیے
نئے لباس ڈھونڈ رہی تھی
پھر تم آئے تو
جیسے ذرّے ذرّے میں
قہوے کے باغات کی خوشبو
وسعتِ صحرا کی مانند پھیل گئی

میں نے شروع میں لکھا تھا کہ تن دیپ نے تن کے دیپ جلائے ہیں۔ ان دیپوں کی روشنی میں ہی تن دیپ نے سارا سفر طے کیا ہے۔ آخر میں ان کی نظم ''پہلا گیت محبت کا'' کے ایک پیرا آپ کو پڑھنے کی دعوت دیتا ہوں۔ تن دیپ میری دُعا ہے تم محبت کے گیت گاتی رہو، ہم سنتے رہیں اور سر دُھنتے رہیں۔ اس خوبصورت مجموعہ کی بہت بہت مبارک ہو۔

پہلا گیت محبت کا
پھر اُفق میں ڈوبتے خورشید کو سمجھائیں
کہ شب وصال شاخساروں کے فروزاں ہوتے ہی
اپنی نیندیں سمندر کے حوالے کر دے
رتجگوں کی گواہی دیتا انجم چشم بھی تا حدِ سحر چمکے گا
اور جب سینکڑوں تارے
وقت کی سونی آنکھوں میں کاجل لگائیں گے
تب خمارِ وصل میں چور متوالے جگنو
صدیوں تک گنگنائیں گے پہلا گیت محبت کا

بکرے

عطاء الحق قاسمی/لاہور

(۱)

جوں جوں عید قریب آ رہی ہے۔ ہمیں اپنے محلے کے چودھریوں، ملکوں، خانوں، گردیزیوں، قریشیوں، گیلانیوں اور میروں وغیرہ پر رشک آنا شروع ہو گیا ہے۔ کیونکہ اب ان سب نے بکرے خرید لیے ہیں، بکرے کیا خرید لیے ہیں، بس یوں سمجھیں کہ جنت میں گھر خرید لیا ہے، جب کہ ہم جیسے رمضانی جنت میں گھر خریدنے کے لیے ابھی تک بیعانے کا انتظام بھی نہیں کر سکے۔ ہم سب رمضانی بھی بہشتی دروازے سے گزرنا چاہتے ہیں، مگر ہمیں کوئی گزرنے ہی نہیں دیتا۔ ویسے ہم گزشتہ کئی دنوں سے راہ چلتے بکروں کو ٹٹول ٹٹول کر دیکھنے میں مشغول ہیں، کوئی اجنبی ہمیں دیکھے تو اس کام میں ہماری مہارت اور اعتماد دیکھ کر یہی سمجھے کہ ہم ابھی ''کھڑے کھلوتے'' پورا ریوڑ خرید لیں گے۔ حالانکہ جس ریوڑ کے ہم خود ''چھارو'' ہیں اس کی قوت خرید اتنی کم ہے کہ انہیں دیکھ کر دوسروں کی قوت خرید خواہ مخواہ بیدار ہونے لگتی ہے۔ گزشتہ روز تو ایک نک چڑھے اور بد لحاظ قسم کے بکرے نے بیچ بازار ہمیں جھاڑ پلا دی۔ کہنے لگا ''یہ تم کیا اتنی دیر سے مجھے ٹٹول ٹٹول کر دیکھ رہے ہو، کیا تم نے اپنی جیب ٹٹول کر دیکھی ہے؟'' ہم نے پریشان ہو کر جیب کو ہاتھ مارا اور کہا ''کیا ہوا جیب کو، کٹ گئی؟'' اس پر بکرا بڑی زہریلی ہنسی ہنسا اور بولا ''تمہاری جیب کاٹ کر کسی نے کیا لینا ہے۔ جاؤ میاں اپنی راہ لو۔ جیسے ہم ہیں، ویسے تم ہو۔ خواہ مخواہ ہمیں ٹٹول ٹٹول کر اپنی ٹہور بنانے کی کوشش کر رہے ہو''۔ اس پر ہم نے کھسیانے ہو کر منت سماجت کے لیے اس کی ٹھوڑی کو ہاتھ لگایا اور ابھی کچھ کہنے ہی کو تھے کہ اس بدذات نے ہمارا ہاتھ جھٹک کر کہا ''اب تم میرے دانت بھی دیکھنا چاہتے ہو، پورے دو دانت ہیں میرے منہ میں۔ اگر تمہاری طرح میرے منہ میں بتیس دانت ہوتے تو میں دیکھتا کہ کون مائی کا لال مجھے قربانی کا بکرا سمجھتا ہے''۔ پیشتر اس کے کہ ہم عزت بچانے کے لیے وہاں سے راہ فرار اختیار کرتے، ایک کالے بکرے نے پیچھے سے آ کر ہمیں ''ٹڈھ'' مارا۔ ایک تو قربانی کا بکرا اور پھر اوپر سے کالا، چنانچہ ہمیں دوہرا غصہ آیا، مگر خاموش رہے کہ اس کے سینگ بھی تھے۔ ہماری اس خاموشی کو اس نے نیم رضامندی سمجھ کر ہمیں ایک ''ٹڈھ'' اور مارا اور کہا ''ایک دو باتیں میں نے بھی تم سے کرنی ہیں!'' ہم نے بے بسی سے کہا ''بھائی صاحب! آپ بھی کر لیں'' اس کلوٹے نے ہمیں لال لال آنکھوں سے گھورتے ہوئے کہا ''جنوبی افریقہ میں سیاہ فام باشندوں پر ہونے والے مظالم کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟'' ہم نے اس کے سینگوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ''مائی باپ! ہم اس کی سخت مذمت کرتے ہیں!'' اس پر اس نے ایک دفعہ پھر ہمیں ہلکی سی ٹڈھ پہنچائی اور کہا ''اور جو سلوک تم لوگ ہمارے ساتھ کرتے ہو، وہ بھول گئے ہو، تم میں سے کسی کو چھینک آ جائے تو کالے بکرے کا صدقہ، سفر پر روانہ ہونے لگے تو کالے بکرے کا صدقہ، سفر سے واپس آئے تو کالے بکرے کا صدقہ، کوئی جادو ٹونا کرتا ہوا تو ایک قدم آگے بڑھ جاتے ہو یعنی کالا بکرا ذبح کر کے اس کی گردن کسی چوک میں جا کر رکھ آتے ہو۔ اور اوپر سے تم بڑے ہمدرد بنتے ہو؟'' ہم نے اس بے ہودہ بکرے کے توہین آمیز طرزِ عمل کو اس کے سینگوں کے صدقے میں نظر انداز کرتے ہوئے لجاجت سے کہا ''بھائی صاحب آپ دیکھیں کہ ہم لوگ کالے دھن کے پیچھے کس طرح پھرتے ہیں اور تو اور ہم تو جوتے بھی کالے رنگ ہی کے پہننا پسند کرتے ہیں بلکہ نائلون کے سیاہ رنگ کے زیر جامے.....'' مگر اس کلوٹے گستاخ بکرے نے ہمیں درمیان ہی میں ٹوک دیا اور کہا ''اب تم نے ایک لفظ بھی منہ سے نکالا تو میں تم سے سمجھ لوں گا!'' یہ سن کر ہمارے ضبط کے بھی بندھن ٹوٹ گئے، چنانچہ ہم نے سارے ادب آداب ایک طرف رکھے اور کہا ''اوئے کالے! میں بہت دیر سے تمہاری بک بک سن رہا ہوں۔ تم اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہو۔ اگر تم اتنے ہی انا پرست ہو تو سینگوں کی موجودگی میں

پورے ریوڑ کے ساتھ گردن نہوڑا کر کیوں چلتے ہو‘ قصاب کے ہاتھ میں چھری بعد میں آتی ہے‘ تم اس کے سامنے گردن پہلے خم کر دیتے ہو۔ ان سینگوں سے تم زیادہ سے زیادہ کمر کھجانے کا کام لیتے ہو اور یا پھر ہم جیسوں کو بلاوجہ ”ٹڈھ“ مار کر سمجھتے ہو کہ تم بڑے پھنے خان ہو...... اوئے سینگوں سے کمر کھجانے اور اپنے جیسوں کو ”ٹڈھ“ مار کر خوش ہونے والے دوکوڑی کے جانور! اپنی اوقات میں رہ‘ ورنہ جیسے تیسے بھی ہوا‘ تجھے کھڑے کھڑے خرید لوں گا!“ ہم نے تو خیر‘ کیا خریدنا تھا‘ اتنے میں ریوڑ کے مالک نے اسے کانوں سے پکڑا اور گھسیٹتے ہوئے ایک چودھری صاحب کے سامنے جا کھڑا کیا۔ خیر‘ بکروں کے ساتھ ہونے والے یہ مکالمے اپنی جگہ‘ اور وہ مسئلہ اپنی جگہ کہ ہم ایسے رمضانی ابھی تک بکروں کو محض ٹٹول ٹٹول کر دیکھنے میں مشغول ہیں‘ بلکہ ہمیں تو لگتا ہے کہ عید آ کر گزر بھی جاتی ہے اور ہمارا یہ شغل جاری رہتا ہے۔

بکروں کے ساتھ ہونے والے مکالمے اوپر کی سطور میں ہم نے اس لیے بھی درج کیے ہیں کہ ہم جیسے تیسے بھی ہیں بہر حال انسانوں کی برادری میں شامل ہیں اور یوں بکروں سے بہر صورت بہتر ہیں۔ چنانچہ وہ جو ہم ایسے انسانوں میں اشرف المخلوقات قسم کے انسان ہیں‘ یعنی بکروں کے ریوڑ کے ریوڑ خریدنے کی پوزیشن میں ہیں‘ ہمیں بکروں کے ہاتھوں ذلیل ہونے سے بچائیں اور کچھ ایسا انتظام کریں کہ آئندہ کسی بکرے کو ان اشرف المخلوقات انسانوں کے کمی کمینوں سے بھی اس قسم کی گفتگو کرنے کی ہمت نہ پڑے۔ اس ضمن میں ہماری تجویز یہ ہے کہ ہر سال عید کے موقع پر ہمیں بکرا الاؤنس دیا جائے تاکہ ہم بھی بازار میں جائیں اور ان گستاخ بکروں میں سے کسی کو کانوں سے کھینچتے ہوئے اپنے گھر کے دروازے پر لا کر باندھ دیں۔ عید کے روز ان کے سری پائے بھون کر کھائیں‘ ان کے تکا بوٹی کر کے محلے میں تقسیم کر دیں‘ ان کی اوجھڑی باہر گلی میں پھینک دیں اور ان کی کھالیں کھینچوا کر جماعت اسلامی کو بھجوا دیں۔ چنانچہ ہمارے اشرف المخلوقات قسم کے انسان اگر ہمیں بھی چھوٹا موٹا انسان سمجھتے ہیں تو براہ کرم ہمیں جلد از جلد بکرا الاؤنس دلوائیں کہ عید قریب آ رہی ہے اور اگر ہم بھی انسان نہیں‘ ان کی نظروں میں بکرے ہی ہیں‘ تو پھر ہمیں مہنگائی الاؤنس دیا جائے جس سے ہم اپنا معیار زندگی بلند کر سکیں تاکہ کم از کم یہ ٹکے ٹکے کے انسان تو ہمیں سرعام ٹٹولنے کی جرأت نہ کر سکیں!

(۲)

گزشتہ روز ہم نے اخبار میں ایک بکرے کی تصویر دیکھی‘ جس کے نیچے لکھا تھا کہ اس بکرے کی قیمت چالیس ہزار روپے ہے‘ بہت جی چاہتا تھا کہ اس بکرے کے خصائص پر ایک کالم لکھا جائے کیونکہ ہمیں یقین ہے کہ چالیس ہزار روپے کی مالیت کا بکرا بیس سیر دودھ صبح اور بیس سیر دودھ شام دیتا ہوگا‘ اگرچہ بکرے کا دودھ دینا خلاف وضع فطری فعل ہے لیکن اس کے نرخ اگر بالا ہوئے ہیں‘ تو یقیناً یہ بکرا غیر معمولی صفات کا حامل ہوگا۔ تاہم اس بکرے کی جو تصویر ہم نے دیکھی ہے‘ اس میں تو کوئی غیر معمولی بات ہمیں نظر نہیں آئی‘ اس بکرے کی شکل بالکل بکروں جیسی تھی‘ لیکن جس طرح سارے چینی جاپانی اور نیگرو ہمیں ایک جیسے لگتے ہیں‘ حالانکہ ان میں کئی ایسے بھی ہوں گے جن کا شمار اپنے اپنے علاقے کے جوانان رعنا میں ہوتا ہوگا اور وہ جدھر سے گزرتے ہوں گے انگلیاں کٹتی چلی جاتی ہوں گی‘ سو ممکن ہے یہ بکرا بھی جو دیکھنے میں بالکل بکرا لگتا ہے‘ اپنی برادری میں خاصا حسین و جمیل شمار ہوتا ہو اور جن بکریوں کے ہاتھ پیلے نہیں ہوئے‘ ان کے والدین اس کے آگے پیچھے پھرتے ہوں‘ اسے اپنے ”گھر“ مدعو کرتے ہوئے اور اس کے سامنے ”وڈ“ رکھتے ہوئے کہتے ہوں کہ یہ ڈش عزیزہ نے اپنے ہاتھوں سے تیار کی ہے۔ اور ہمارے اس شبے کو تقویت یوں بھی ملتی ہے کہ یہ عزیز غالباً اسی طرح کی دعوتیں کھا کھا کر ہی خوب پلا ہوا ہے‘ قد کاٹھ کے لحاظ سے بھی یہ خاصا بارعب لگتا ہے۔ اس کی توند بھی نکلی ہوئی نہیں ہے‘ لگتا ہے کہ اس نے اپنی ڈائٹ بھی متوازن رکھی ہوئی ہے‘ یا ممکن ہے‘ وہ صبح و شام لمبی واک پر جاتا ہو‘ رسی کودتا ہو‘ ان ڈور اور آؤٹ ڈور گیمز میں حصہ لیتا ہو‘ وجہ خواہ کچھ بھی ہو‘ یہ بکرا ہمیں تصویر میں خاصا صحت مند اور سمارٹ لگا ہے تاہم اخبار میں صرف اس بکرے کی تصویر شائع ہوئی ہے‘ اس کے مالک کی تصویر شائع نہیں ہوئی‘ اگر مالک کی تصویر بھی شائع ہوئی ہوتی‘ تو ہم پورے یقین سے کچھ اور معروضات بھی پیش کرتے‘ چنانچہ تصویر کی عدم موجودگی کی وجہ سے‘ محض شواہد کی بنا پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس بکرے کا مالک ان پڑھ اور سیاسی شعور سے بے بہرہ لگتا ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ ہم لوگ اونچے لمبے اور بارعب شخص کے حامل لوگوں

کے کس قدر قدر دان ہیں' ہمارے ہاں لیڈر شپ کا بنیادی معیار لیڈر کا ''اجلا لماتے سوہنا'' ہونا ہے چنانچہ ماضی میں ایسے لوگوں کو بھاری تعداد میں ووٹ بھی ملتے رہے ہیں' اس اچے لے تے سوہنے بکرے کا مالک اگر ان پڑھ نہ ہوتا اور سیاسی شعور سے اس قدر بے بہرہ نہ ہوتا' تو اسے صرف چالیس ہزار روپے میں بازار میں فروخت کے لیے پیش نہ کرتا' بلکہ انتخابات کا انتظار کرتا اور اسے الیکشن میں کھڑا کر دیتا' ہمیں یقین ہے کہ یہ ''جوان رعنا'' بھاری ووٹوں سے کامیاب ہوتا اور اس بکرے کے مالک کے ایک نہیں کئی چالیس ہزار روپے کھرے ہو جاتے مگر افسوس

بکرا فروختند و چہ ارزاں فروختند!

تاہم ممکن ہے ہم نے بکرے کے مالک کے بارے میں جو مفروضہ قائم لیا ہے کہ وہ ان پڑھ اور سیاسی شعور سے بے بہرہ ہے' صداقت پر مبنی نہ ہو' بلکہ صورت حال اس کے برعکس ہو' یعنی وہ سیاسی شعور سے اس قدر بہرہ ور ہو کہ اس نے انتخابات کا انتظار کرنے کی بجائے' ہتھوں ہتھ' چالیس ہزار روپے کھرے کرنے ہی میں اپنی بہتری سمجھی ہو کہ

کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

یعنی جب انتخابات ہوں۔ اس وقت تک یہ جوان رعنا چھڑی کے سہارے چلتا ہو۔ اس کے ہاتھوں میں رعشہ ہو اور یہ طاقت کے ٹیکے لگوا کر ''یاد ایام عشرت فانی'' تازہ کرتا ہو' سو اس بکرے کے مالک نے جو فیصلہ کیا ہے' وہ ہمیں خاصا عقلمندانہ لگا ہے۔ تاہم اس ضمن میں ہمارا ایک برادرانہ مشورہ یہ ہے کہ عام انتخابات نہیں تو بلدیاتی انتخابات بہر حال ہونے ہیں۔ چنانچہ وہ اگر اس بکرے کو بلدیاتی انتخابات کے لیے تیار کرے' تو اس کی کامیابی یقینی ہے بلکہ اس کا امکان بھی موجود ہے کہ وہ میئر کا انتخاب بھی جیت لے' چنانچہ اگر یہ بکرا لاہور کارپوریشن کا میئر ہو جائے' تو بھی اس کے مالک کے وارے نیارے ہیں' مگر ممکن ہے ہمارا یہ مشورہ بعد از وقت ہو یعنی یہ بکرا اب تک چالیس ہزار روپے میں بک بھی چکا ہو' یہ بات ہم یوں کہہ رہے ہیں کہ ہمارے ہاں جوہر قابل کو بکتے دیر نہیں لگتی۔

خیر یہ ساری باتیں تو بلا ارادہ قلم پر آ گئیں' حالانکہ ہم تو اس بکرے کے خصائص پر کالم لکھنا چاہتے تھے' مگر جھجک اس لیے رہے تھے کہ اتنے قیمتی بکرے پر اگر بکرے کی اجازت کے بغیر کچھ لکھا' تو کہیں وہ ہم سے رائلٹی کا مطالبہ نہ کر دے کہ ہم نے اپنے کالم میں اس کا نام استعمال کیا ہے' دوسرے بڑے لوگوں کے بارے میں لکھتے ہوئے ہمیں یوں بھی ڈر لگتا ہے کہ کوئی لفظ ادھر ادھر ہو گیا' تو کہیں ہتک عزت کا دعویٰ نہ دائر کر دیں۔ چنانچہ اس کالم میں نہ لکھنے کے ارادے کے باوجود اگر ہم اس ذی شان بکرے کے بارے میں کچھ لکھ گئے ہیں تو یقین جانیں بہت ڈرتے ڈرتے اور سنبھل سنبھل کر لکھا ہے کہ کہیں یہ چالیس ہزار کا بکرا ہم سے ہتک عزت کے ایک لاکھ نہ وصول کرلے' تاہم اس احتیاط کے باوجود اگر ہمارے قلم سے کوئی غیر محتاط لفظ نکل گیا ہے یا کوئی ایسا فقرہ ہم سے لکھا گیا ہے جس سے بکرے یا اس کے مالک کی شان میں کوئی گستاخی سرزد ہو گئی ہو' تو ہم تہہ دل سے معذرت خواہ ہیں' کیونکہ ہمارا مقصد کسی کی دل آزاری نہیں' ہمارے دل میں تو ایسے بکروں کے لیے بے پناہ عزت ہے' جو اگر بکاؤ مال ہیں تو کھل کر اس کا اعتراف کرتے ہیں' قیمت کا TAG اپنے گلے میں ڈال کر رکھتے ہیں' خود کو نا قابل فروخت نہیں کہتے۔ اسی طرح ان کے مالک بھی ہمارے لیے قابل احترام ہیں' جو بکروں کو پال پوس کر ان کے دام کھرے کرتے ہیں اور پھر ان کی گردنوں پر چھریاں چلنے کے لیے ان کی رسی گاہک کے ہاتھ میں تھما دیتے ہیں۔ یہ بڑے کھرے لوگ ہیں' یہ قربانی کے بکرے پالتے ہیں اور انہیں قربانی کا بکرا کہہ کر ہی آگے فروخت کرتے ہیں' خود کو بیوپاری کہتے ہیں' سیاست دان نہیں کہلاتے۔

ممتاز افسانہ نویس

نسیم سکینہ صدف

کے افسانوں کا پہلا مجموعہ

''آؤ مجھے غلام کرلیں''

طباعت کے آخری مراحل میں ہے

آراء:

عطاء الحق قاسمی، حسن عباسی، دستگیر شہزاد

ناشر:

نستعلیق پبلی کیشنز

F-3 الفیروز سنٹر غزنی سٹریٹ، اُردو بازار لاہور

0423-7351963

03331-4489310

nastalique786@gmail.com

طنز و مزاح

عذیر الطاف اور راج نگر

حافظ مظفر محسن/لاہور

عزیر الطاف ہمارے بہت اچھے دوستوں میں سے ایک ہے اور جناب کا اسٹائل بھی ہمارے ہی جیسا ہے۔ جناح باغ میں سیر کے دوران جب ہم ہنستے ہنستے تھک جائیں تو پھر ہم زور زور سے ہنسنا شروع کر دیتے ہیں جب ہنستے ہنستے ہم بے حال ہو جائیں تو ہم ایک دو منٹ کے وقفے کے بعد پھر سے ہنسنے لگتے ہیں۔ میں نے غور کیا مفکر ٹائپ عزیر الطاف ہنستے ہوئے بھی سنجیدہ ہی دکھائی دیتا ہے۔ مجھے ایسے دوستوں سے ڈر بھی لگتا ہے۔ کیونکہ ایسی سنجیدگی کسی بڑی فنکاری کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ میں نے اکثر ایسی ''دنیاداری'' سی ایس پی افسروں میں دیکھی ہے۔ وہ لطیفہ سن کر ہنس بھی رہے ہوتے ہیں مگر در پردہ وہ کسی اہم مسئلے کا سلوشن تلاش کر رہے ہوتے ہیں یا کسی بڑے پروجیکٹ کی تکمیل کے طریقہ کار میں مگن......

یقیناً میری ایسی غیر فطری گفتگو سے میرا دوست عزیر الطاف پریشان ہو جائے گا۔ میں نے دیکھا ہے میں اپنے لکھاری دوستوں کو سمجھدار انسان مفکر، دانشور یا بہت اچھا کاروباری یا پھر کہہ دوں کہ یہ بہت اچھا لیکچرر ہے تو وہ اس بات کو کوئی خاص ''توجہ'' سے نہیں سنتا۔ لفٹ ہی نہیں کرواتا یا یوں کہہ لیں سنجیدہ نہیں لیتا۔ میں کہہ دوں کہ اس کی آج تحریر مشہور ادبی میگزین ''لطف محرومی'' میں چھپی ہے جو علمی و ادبی دستار سے بہت معیاری ہے تو وہ قمیض کا اوپر والا بٹن کھول کر سینے کو ہوا لگوانے لگتا ہے۔ گویا ''کام برداشت'' سے باہر ہے۔

اس لیے میں چاہتا ہوں کہ میں عزیر الطاف کے افسانوی اسٹائل پر بات کروں۔ کیونکہ سخت گرمی میں الطاف حسین (المعروف الطاف بھائی آف لندن مقیم) کی طرح اوپر والے دو بٹن کھول کے سینے کو ہوا بھی لگوائے اور عوام کو خوش بھی کرے۔

جناح باغ میں ''واک'' کے دوران بڑے بڑے جھوٹ چھوڑنے کا جو رواج بدر سعید نے ڈالا ہے۔ خوشی بلکہ فخر کی بات ہے کہ عذیر الطاف بھی اس میں اپنا وافر حصہ ڈالتا ہے۔ بدر سعید نے بتایا کہ گنگا رام ہسپتال 1623 میں تین چار ارب روپے کی لاگت سے بنا تھا۔ اصل میں سر گنگا رام ایک غریب گھر کا سپوت تھا۔ اس کا دو ارب کا پرائز بانڈ نکلا تو اُس نے سوچا کیوں نہ میں کوئی نیکی کا کام کروں اور نام کماؤں۔ سو اُس نے اپنا دو ارب اور کچھ اپنے دوستوں سے لے کر تین چار ارب سے لاہور کا سر گنگا رام ہسپتال تعمیر کروا دیا!

1623ء میں اربوں کی باتیں...... پرائز بانڈز اور......اور......بس......اب میں کیا کروں؟ اس سے پہلے میں اپنا حصہ ڈالتا۔ عذیر الطاف نے نہایت سنجیدگی سے فرمایا۔

یار! رات بڑی مشکل میں پڑا رہا۔ ڈاکٹر عبدالقدیر خان آئے تھے۔ کہنے لگے میں ایٹم بم بنانے کا طریقہ بھول گیا ہوں۔ ڈرتا ہوں اگر کسی نے ایٹم بم بنانے کا طریقہ پوچھ لیا تو میں کیا بتاؤں گا؟ میں نے بتایا کہ میں بتا دیتا ہوں مگر اک شرط پر کہ آپ اب یہ اک تو دوبارہ نہیں بھولیں گے اور دوسرا کسی کوریا دوریا کو نہیں بتائیں گے۔

ہماری ہنسی نہیں رُک رہی تھی۔ مگر عذیر الطاف نہایت سنجیدہ لگ رہا تھا اور ابھی بہت کچھ کہنے کے موڈ میں تھا کہ مغرب کی اذان ہو گئی۔

میں نے جب عذیر الطاف کی کتاب ''راج نگر'' دیکھی تو مجھے لگا کہ اس کتاب میں بھی اُسی طرح کی باتیں ہوں گی۔ جو ہم اذانِ مغرب سے پہلے جناح باغ میں واک کے دوران کرتے ہیں۔

حیرت ہوئی کہ ''راج نگر'' نامی کتاب میں عذیر الطاف نے کچھ نہایت سنجیدہ موضوعات کے حوالے سے چھوٹی چھوٹی کہانیاں بیان کی ہیں۔ جنہیں پڑھ کر آپ کو میری اوپر بیان کردہ باتیں بری لگنے لگیں گی۔ مگر میں اب کیا کر سکتا ہوں کہ میں اپنا لکھا عام طور پر کاٹتا نہیں۔ آپ میری باتوں پر مزید غور نہ کریں۔ کیونکہ آپ کا موڈ ''آف'' ہو جائے گا اور عذیر الطاف کی باتیں، کہانیاں یا افسانے پڑھنے کے لیے ضروری ہے بلکہ پہلی شرط ہے کہ آپ کا موڈ اچھا ہو۔

گویا آپ کا موڈ رات گیارہ بجے کے بعد اچھا ہوتا ہے تو چلیں پھر رات گیارہ بجے ہی یہ کتاب پڑھنا شروع کیجیے گا۔ کیونکہ صبح ہونے تک آپ یہ کتاب ساری کی ساری ایک ہی نشست میں پڑھ چکے ہوں گے۔ کیونکہ میں تو اچھی تحریر ایک ہی نشست میں پڑھنے کا عادی ہوں۔ یقین نہ آئے تو حسن عباسی سے پوچھ لیں۔

مگر حسن عباسی کو ابھی فون مت کیجیے گا۔ کیونکہ وہ ابھی ابھی مجھ سے عذیر الطاف کی کتاب راج نگر لے کر گیا ہے اور میری اور حسن عباسی کی کتاب کے مطالعے کے حوالے سے عادتیں ملتی جلتی ہیں۔

افسانہ

سپیرا

عذرا اصغر

مارچ کے چمکیلے سورج کو ہلکی سرمئی بادل کی ننھی سی ٹکڑی نے دھندلا دیا تھا۔ منیر نے اپنا کھدر کا کئی دن پہلے کا دُھلا کرتا، کیل پر سے اُتار کر جھاڑ کر پہنا اور باہر جانے کے لیے مُڑا تو ماں نے چولہے کے پاس سے ہانک لگائی۔

''وے پتر منیر...... لے روٹی تو لے جا'' اس نے چھپے ہوئے ہلدی کے رنگ کے صافے سے جھاڑن میں دو موٹی گھی سے چپڑی روٹیاں لپیٹ کے منیر کو تھما دیں۔ منیر نے شکر گزاری سے مسکرا کر ماں کی طرف دیکھا اور بولا۔

''تو اکیلی سارا دن کام کرتی ہے۔ شیداں کو بھی کام پہ لگایا کرناں''۔

وہ ہنس دی۔ ''پتر کھا کھیل لینے دے اسے۔ بڑا زمانہ پڑا ہے کام کا۔'' وہ چڑ گیا۔ ''دیکھ تو اسے بگاڑ دے گی۔ آخر اسے کسی کے گھر بھی جانا ہے۔ سدا تو تیرے پاس نہیں بیٹھی رہے گی۔ نہیں کراتی تو نہ کرا، تیری مرضی۔ میں تو تیرے بھلے کے لیے ہی کہہ رہا تھا۔'' وہ چپ ہو گیا۔

''لے میرا بھلا تو جبھی ہو گا جب تیری گھر والی آ جائے گی۔ شیداں کا مجھے کیا سکھ۔ وہ تو پرایا دھن ہے۔''

''گھر والی'' کی بات پر وہ واقعی دل ہی دل میں خوش ہو گیا۔

''گھر والی'' اس کے سامنے چھیماں کا سراپا گھوم گیا۔ اس کا جی چاہا وہ یک دم کھلکھلا کے ہنس پڑے اور ماں کو بتا دے کہ میں نے تیرے لیے بہو ڈھونڈ لی ہے۔ ماں وہ تیرے گھر کے سارے کام منٹوں میں نمٹا دیا کرے گی اور صبح سویرے ہی تیرے منیرے کو چپڑی روٹیاں پکا کر اسی طرح دیا کرے گی جس طرح اب تو دیتی ہے'' مگر وہ چپ رہا اور پھر جیب میں ہاتھ ڈال کے میلے سے خریدا ہوا پلاسٹک کا بٹوہ نکالا جس میں اس نے فلم ایکٹرس کی تصویر لگا رکھی تھی۔ کیوں کہ وہ اسے چھیماں سے ملتی ہوئی لگتی تھی۔ اس نے تصویر کو ماں کی نظروں سے بچا کر بٹوے میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''ماں! دو آنے تو دے دے۔ سگریٹ لینی ہے۔'' پیسے لے کے وہ دروازے کو ہو لیا۔ دروازے پر پڑے ٹاٹ کے باہر اس کی چھوٹی بہن شیداں گاؤں کی دوسری ہم عمر لڑکیوں کے ساتھ ''کوکلا چھپاکی'' کھیل رہی تھی۔ اس نے لحہ بھر رُک کے غور سے ان سب کو دیکھا۔ چھیماں ان میں نہ تھی۔ چلتے چلتے اس نے مناسب سمجھا کہ شیداں کو ذرا ڈانٹ دے۔ ماں تو واقعی اسے بگاڑ دے گی۔ اس نے بڑی تشویش سے شیداں کے بڑھتے ہوئے سراپے کو دیکھا۔ وہ بولنا ہی چاہتا تھا کہ شیداں کھیل چھوڑ کے خود ہی اس کے پاس آ گئی اور بڑی لجاجت سے اس کا ہاتھ پکڑ کر بولی:

''ویرا آج تو میرے لیے شہر سے چُنی لائے گا ناں؟ لال سوہے رنگ کی۔''

''ہاں ہاں! دہاڑی مل گئی تو آج ہی لا دوں گا۔'' وہ شیداں کا ہاتھ جھٹک کے آگے بڑھ گیا۔ شیداں کے لیے چنی وہ آج ضرور ہی لا دے گا۔ جھاڑن میں بندھی چپڑی روٹیاں اس نے اچھی طرح بغل میں دباتے ہوئے سوچا۔ ''کل چاچا منگل کہہ رہا تھا۔ دو تین مہینے کے لیے مزدوری لگ رہی ہے۔ کل سویرے ہی آ جانا۔ چوہدری دین محمد اپنی نئی کوٹھی میں دو کمرے اور ڈلوانے لگا ہے۔'' یہ سوچتے ہوئے اسے پھر شیداں کی چنی کا خیال آ گیا'' ہاں چوہدری سے آج کی دہاڑی لیتے ہی شیداں کی چنی خریدوں گا اور...... اور فوراً ہی اسے چھیماں کا خیال بھی آ گیا۔

''میں آج چھیماں کے لیے بھی کچھ خریدوں گا۔ مگر کیا؟'' وہ سوچنے لگا۔

''اچھا میں چھیماں کو لال پراندہ لے کر دوں گا۔ موتیوں والا لال پراندہ۔ وہ کتنا خوش ہو گی۔'' پراندے اور چھیماں کے خیال پر وہ آپ ہی آپ مسکرا دیا اور خود ہی خود گنگنانے لگا۔

''لال پراندہ...... ایہو گل آ ہندا''

چلتے چلتے وہ آپ ہی آپ ہنسنے لگا۔ کئی دنوں سے اس نے چھیماں کو نہیں دیکھا تھا۔ چھیماں شاید گھر سے نکلی ہی نہیں تھی۔ ماں نے بتایا تھا کہ اس کے بھتیجا ہوا ہے۔ ادھر وہ خود بھی مزدوری کی تلاش میں سارا دن مارا مارا پھرتا تھا۔ کئی دنوں سے وہ بیکار تھا اور کام کی تلاش میں تھا اور آج اسے کام مل گیا تھا۔ وہ دیہاڑی کرنے جا رہا تھا۔ اسی دن وہ شیداں کی چنی اور چھیماں کے پراندے کا سوچ رہا تھا۔ انھی خیالوں میں اُلجھا وہ چاچا منگل کے پاس جا پہنچا۔

''آ گیا ہے کاکا منیر؟'' منگل نے اسے دیکھ کر پوچھا۔ جیسے اسے یقین نہ آیا ہو کہ وہ واقعی آ گیا ہے۔

''ہاں چاچا آ گیا ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔ منگل کے سوال کی تصدیق تو اسے کرنا ہی تھی۔

''چل کاکا پھر چلیے۔'' منگل اُٹھ کھڑا ہوا۔

چوہدری کی نئی کوٹھی شہر سے قدرے باہر، گاؤں اور شہر کے سنگم پر، کھلے اور صاف ستھرے علاقے میں تھی۔ بہت بڑی اور خوبصورت۔ جس کے گرداگرد آم اور مالٹوں کے پیڑ تھے اور دور تک پھیلے سرسبز کھیت۔

چوہدری نے بہت چاؤ سے اسے تعمیر کرایا تھا۔ مگر اس کا پچھلا حصہ ابھی نامکمل تھا۔ کاروبار میں کچھ منافع کے بعد اب چوہدری کوٹھی کے اس پچھلے حصے میں نوکروں کے لیے کوارٹر بنوانا چاہتا تھا۔ جن کی بنیادیں کوٹھی کے ساتھ پہلے ہی رکھی جا چکی تھیں۔ کوٹھی تو مکمل ہو گئی تھی مگر کاروبار میں کچھ خسارے کی وجہ سے پیسے ختم ہو گئے تھے۔ جس کی وجہ سے نوکروں کے لیے کوارٹر نہیں بن سکے تھے۔

منیر نے روٹیاں اور چادر ایک طرف احتیاط سے رکھ دیں اور گارے میں پیروں تک اُتر کر اسے متھنے لگا۔ منگل نے چادر کو سر کے گرد لپیٹا فیتہ کھولا اور منیر بولا" کاکا گارا سان لیا۔"

"ہاں چاچا..... گارا تیار ہے۔"

"لا پتر پھر اینٹیں پکڑا۔"

"چاچا" منیر نے منگل کو اینٹیں پکڑاتے ہوئے کہا۔

"چاچا..... تم سے تو بڑے آدمیوں کے یہ نوکر ہی بھلے۔"

"جس کو نہیں جانا کا کا وہی اچھا ہے۔"

منگل نے اینٹ پر اینٹ جماتے ہوئے بڑی بردباری سے سر ہلایا۔

"ذرا سوچ تو چاچا، ان کے نوکر بھی پکے سیمنٹ سے بنے مکانوں میں رہتے ہیں اور ہمارے جیسوں کو جھونپڑا بھی نصیب نہیں ہوتا۔" منیر نے دکھ سے کہا۔

"یہ بات نہیں یارا۔ ہم مجبوروں کی جندگی ان بڑے آدمیوں سے بھی کہیں اچھی ہے۔" منگل کا انداز فلسفیانہ تھا۔

"کیا خاک اچھی ہے چاچا۔ ہماری جندگی تو ساری کی ساری ایک ذرا سی آس میں ہی کٹ جائے ہے۔" منیر پہ بدستور افسردگی طاری تھی۔

"تو ابھی بچہ ہے منیرے۔ تو یہ باتیں نہیں سمجھے گا۔" منگل نے سر ہلایا۔

"سمجھتا کیوں نہیں چاچا۔ میں سب سمجھتا ہوں۔ اب دیکھ شیداں میری بہن، کب سے ایک چنی لانے کو کہہ رہی ہے۔ یہ شوق نہیں چاچا ضرورت ہے۔ اس کی چنی لیر لیر ہو گئی ہے مگر....." اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ اس کے گلے میں پھانک سا گیا تھا۔

"جب تک کوئی چیز نہ ملے تبھی تک اس کی طلب ہوتی ہے پتر۔ چنی بے شک پھٹی ہوئی ہو، کام تو دے رہی ہے نا؟ رب کرے گا نویں بھی آ جائے گی۔" منگل نے تسلی دی۔ منیر چپ رہا۔

شیداں کی چنی کے ساتھ اسے چھیماں کا پراندہ بھی یاد آ گیا تھا۔ وہ گارا اینٹیں دیتا رہا اور منگل اینٹ پہ اینٹ جماتا رہا۔ دوپہر تک دیواریں اتنی اُٹھ گئیں کہ مچان باندھنا پڑی۔ منگل کو اس تیزی سے کام کرتا دیکھ کے منیر کو جھٹکا لگا۔

بولا "چاچا ہولی ہولی کام کر۔ اتنی تیزی سے کام کیا تو دو دن میں ختم ہو جائے گا اور پھر۔" منگل کے ہاتھ رُک گئے۔ منیر ٹھیک ہی تو کہہ رہا تھا۔ کام جلدی ختم ہو گیا تو اس کا مطلب ہے ان کی روزی بھی ختم۔ پھر وہی انتظار..... ہاتھ پہ ہاتھ دھرے گھر بیٹھے رہو اور چار دن میں جو کمایا ہے وہی کھا کھا کے ختم کرتے رہو۔

اس نے سر سے چادر اُتار کے ماتھے سے پسینہ پونچھا اور دیوار کے سائے میں بیٹھ کے سانس لینے لگا۔ منیر نے اپنا پسینے سے بھیگا کھدر کا کرتا اُتار کر جھاڑا اور پھر پہن لیا۔ نلکے سے جا کر منہ ہاتھ دھویا اور جھاڑن سے روٹی کھول کے کھانے لگا۔ گھی سے چپڑی نمکین روٹیاں اور پیاز۔ منگل بھی کھانا کھانے لگا اور دونوں کھانا کھاتے ہوئے یوں لگ رہے تھے جیسے وہ بالکل اجنبی ہوں۔ اپنے اپنے خیالوں میں گم۔ اچانک بین کی آواز آنے پر منیر چونک اُٹھا۔

"چاچا! سانپ کا تماشا دیکھے گا؟" وہ بچوں کی طرح خوش ہو کے بولا اور جواب کا انتظار کیے بغیر آپ ہی آپ مسکرانے لگا۔ منگل بدستور آم کے اچار کے ساتھ خشک روٹی کے ٹکڑے سٹکتا رہا۔ سپیرا بین بجاتا سامنے سے گزرا تو منیر نے آواز دی۔ سپیرا آن کر سامنے بیٹھ گیا۔ منیر نے روٹی کا آخری لقمہ منہ میں ٹھونس کر جھاڑن سے ہاتھ پونچھے اور جھاڑن ایک طرف رکھ دیا۔

"یار کون کون سے سانپ ہیں تیرے پاس؟" اس نے پوچھا۔

"تجھے کس چیز کی تلاش ہے؟" سپیرے نے اپنی لال لال آنکھیں اس کے چہرے پر گاڑ کے ایسے پوچھا کہ منیر سچ مچ چونک پڑا۔

"تیرے پاس اور کیا ہے تو ہی بتا؟"

"جوگی کے پاس تیرے ہر درد کی دوا موجود ہے۔" سپیرے نے اپنی جھولی نزدیک کھسکالی۔

"کیا نام ہے تیرا جواناں؟"

"محمد منیر" اس نے نہایت سعادت مندی سے کہا اور سپیرے نے گرم جوشی سے اپنا ہاتھ مصافحہ کے لیے منیر کی طرف بڑھایا۔ اس نے بھی آہستہ سے اپنا ہاتھ سپیرے کے ہاتھ میں تھما دیا۔

"تجھے ایک شے دیتا ہوں۔ وعدہ کر اور قسم کھا کہ تو اس کی حفاظت کرے گا۔" سپیرے نے اپنی سرخ آنکھیں منیر کی آنکھوں میں گاڑ دیں۔

"میں وعدہ کرتا ہوں" منیر نے جھجکتے ہوئے جواب دیا۔

"بھائی سب سے پیاری چیز ہوتی ہے۔" سپیرے نے تقریر کے انداز میں کہنا شروع کیا۔

"میں تجھے بھائی کہہ رہا ہوں۔ جو چیز تجھے دینے لگا ہوں اسے سنبھال کے رکھنا۔ ہر مراد پوری ہو گی۔ جو مانگے گا ملے گا۔" "لے ہاتھ کھول۔"

منیر نے اپنی کھردری ہتھیلی اس کے سامنے پھیلا دی۔ سپیرے نے جھولی میں جھانکا۔ کچھ چیزیں

اِدھر اُدھر اُلٹی پلٹیں اور میلی سی ایک ڈبیہ نکال کر کپڑے سے صاف کی۔ پھر اسے چوما۔ ماتھے سے لگا کے چسکارا۔ منیر ہاتھ پھیلائے گم صم، سانس روکے بیٹھا دیکھتا رہا۔ سپیرے نے سندور میں لتھڑے ننھے ننھے بالوں کا ایک چھوٹا سا گچھا منیر کی سخت ہتھیلی پر رکھ دیا۔ منیر کا دل اس تیزی سے دھڑکا، مانو نکل کے باہر آ پڑے گا۔ سپیرے نے ایک ہاتھ سے اس کا ہاتھ تھاما، دوسرے ہاتھ کو جھولی میں ڈال کے چھوٹی سی مٹی کی ہنڈیا نکالی۔ ہنڈیا کے منہ پر بندھا میلا، کچیلا سا کپڑا اُنگلیوں کی مدد سے کھولا اور گز بھر لمبا سانپ نکال کے منیر کی ہتھیلی پر چھوڑ دیا۔ منیر کا تیزی سے دھڑکتا دل یک دم رُک گیا۔ اس کے ماتھے پر پسینے کے ننھے ننھے موتی چمکنے لگے۔ چھیماں کا حسین تصور پھر سے اس کے ذہن سے اُڑ گیا۔

''میں نے تجھے بھائی کہا ہے۔ کلمہ پڑھ، یہ گیدڑ سنگی ہے۔ جسے یہ مل جائے اس کے نصیب جاگ اُٹھتے ہیں۔ مجھے پیسے کا لالچ نہیں۔ پیسے کا لالچ ہوتا تو ہزاروں کما چکا ہوتا۔ بس تجھے بھائی جو کہہ بیٹھا ہوں۔ اسے اپنے پاس رکھ، کسی کو بتانا نہیں۔ بس سنیچر کے سنیچر صبح اُٹھ کے اس میں تھوڑا سا سندور ڈالنا نہ بھولنا۔ جو چاہے گا پورا ہوگا۔ جس کی طرف نظر اُٹھا کے دیکھ لے گا وہ تیری ہوگی۔ اللہ چاہے تیرے مقدر کا ستارہ چمکنے لگا گا۔''

''سپیرے نے اپنا بھدا کالا ہاتھ منیر کے سانپ والے ہاتھ پر اوندھا رکھ لیا۔ سانپ دو ہتھیلیوں کے بیچ دھیرے دھیرے کلبلا رہا تھا۔ منیر کے سارے جسم میں کانٹے سے چبھنے لگے۔ سپیرا بار بار ایک ہی جملہ دہرائے جا رہا تھا۔ پھر اس نے سانپ اُٹھا کے ہنڈیا میں واپس رکھ دیا۔ منیر نے لمبا سانس کھینچا۔ لال بالوں کے گچھے کو کاغذ میں لپیٹ کے پڑیا کرتے کی سامنے والی جیب میں رکھ لی۔ اب اس کے سامنے چھیماں کا مجسمہ تھرک رہا تھا۔ پڑیا کو اچھی طرح سنبھال چکنے کے بعد وہ اُٹھا اور دھیرے دھیرے چلتا ہوا منگل کے پاس جا کے بیٹھ گیا جو دیوار سے ٹیک لگا کر اونگھ رہا تھا۔ منیر رک رک کے بولا: ''چاچا! کچھ پیسے نہیں مل جائیں گے؟''

''کیا مال مارا ہے سائیں سے؟'' منگل کی بوڑھی ادھیڑ عمری کی آنکھوں میں شرارت اُمڈی۔

''چاچا سائیں بابا کو دینے ہیں۔ تعویذ لیا ہے۔'' اس نے بدستور آنکھیں جھکائے رکھیں۔ مبادا منگل کو اس کی آنکھوں میں چھیماں کا سراپا نظر نہ آ جائے۔

''چوہدری دین محمد بھی اندر گیا ہے۔ اسے باہر آ لینے دے آج کی مجوری مانگ لیتے ہیں۔'' منگل نے تسلی دی۔

ایک دن کی مزدوری ڈھائی روپے بنتی تھی اور سپیرے نے گیدڑ سنگی کا نذرانہ تین روپے طلب کیا تھا۔ منگل کے ہاتھ سے ڈھائی روپے پکڑ کر منیر نے اٹھنی چپکے سے کھیسے میں ڈال لی اور دو روپے کا نوٹ آگے بڑھا کر بولا۔

''یارا میں تیری اس سے زیادہ خدمت نہیں کر سکتا۔ یہ معمولی نذرانہ ہے۔ قبول کر۔''

''میں نے تجھے بھائی کہا ہے۔ تیری خوشی میری خوشی۔ تو بے شک یہ بھی نہ دے۔ مگر میں تیرا دل نہیں توڑوں گا۔'' سپیرے نے کہا اور نوٹ منیر کے ہاتھ سے جھپٹ کے لے لیا اور دھوتی کے وٹ میں اڑس لیا۔ پٹاری اُٹھائی اور بین بجاتا سڑک پر چل دیا۔

''شیداں کی چٹی'' اس کے کان میں کسی نے کہا۔ ''کل آ جائے گی''

اس نے کان بند کر لیے۔ چھیماں کی ڈولی اسے سامنے نظر آ رہی تھی۔

''اب میں مزدوری کا ایک ایک پیسہ جمع کروں گا۔ پائی پائی جوڑوں گا۔ کچھ پیسہ جمع ہو جائے تو ماں سے کہوں گا جا چھیماں کا ہاتھ مانگ لے۔'' باقی کا سارا دن وہ ہوا میں اُڑ اُڑ کر گارا اور اینٹیں منگل کو تھماتا رہا۔ سورج چھپتے سے جب وہ گھر پہنچا تو بالکل تر و تازہ نظر آ رہا تھا۔ اسے اپنے چاروں طرف ڈھولک کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں اور خیالوں میں لال پروے والی ڈولی رقص کر رہی تھی۔ جس میں چھیماں گھونگھٹ کاڑھے بیٹھی مسکرا رہی تھی۔ جیسے وہ اسے دیکھ کر مسکرایا کرتی تھی۔ وہ خیالوں میں ڈوبا گھر میں داخل ہوا تو سامنے ہی شیداں مل گئی۔ وہ سُن سا ہو گیا۔ شیداں چہک کے بولی۔

''ویرا میری چٹی لیا ندی؟''

''شیداں میری بہن آج دیہاڑی نہیں ملی کل ضرور لا دوں گا۔''

''اس نے بہن کے سر پہ ہاتھ پھیرا۔

''چل ری! آتے ہی تقاضے شروع کر دیتی ہے۔ دیکھتی نہیں ویر سویر کا تھکا ہوا آیا ہے۔ جا منگی سے لسی کا گلاس بھر کے لا۔''

ماں نے شیداں کو ڈانٹ پلائی۔ شیداں منہ بسورتی چلی گئی۔ ماں نے پرچھتی سے پکی چینی کی پلیٹ اُٹھائی اور کروشئے کا بُنا ہوا رومال اُٹھا کے پلیٹ منیر کے آگے کرتے ہوئے بولی۔

''لے پتر گڑ کھا لے۔ سویرے کا تھکا ہوا ہے۔''

''کہاں سے آئے؟'' منیر نے ایک لڈو اُٹھا کے منہ میں رکھتے ہوئے پوچھا۔

''اپنا نمبردار ہے نا۔ اس کی چھوکری چھیماں کی بات پکی ہوئی ہے۔''

''چھیماں کی بات؟ کہاں؟'' کڑواہٹ سے اس کا منہ بھر گیا۔

''بہت اچھا کرم ہے چھوکری کا۔ لڑکا شہر میں کسی دکان پر پکا لگا ہوا ہے۔''

ماں کہے جا رہی تھی مگر اسے سنائی نہیں دے رہا تھا۔ اس نے اپنے دھیان میں جیب سے گیدڑ سنگی کی پڑیا نکالی اور ماں کو دیتے ہوئے بولا۔

''اسے چولہے میں رکھ دے ماں اور مجھے ذرا سونے دے۔ سر میں بڑا درد ہے!''

افسانہ

اسکاؤٹ گرل

پرویز شہریار

میرے ایک سوال کے جواب میں اُس نے بتایا۔

''صاحب، کبھی کبھی تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میرے جسم کے حساس حصوں پر گرم گرم انگارے رکھے جارہے ہیں۔ میرے کول انگوں کو کوئی اپنے چری بوٹوں سے کچل رہا ہے...... میری آنکھوں سے درد کے آنسو ٹپکنے لگتے ہیں لیکن کلائنٹ کے سامنے ہمیں رونے کی اجازت نہیں ہوتی ہے۔ ہم اپنے ہونٹوں پر ناقابلِ برداشت درد کی کراہٹ کے باوجود مسکان سجانے اور سمیٹنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس جارحانہ عمل سے مردوں کی انا کو تسکین ملتی ہے اور وہ ٹپ کے طور پر ہمیں انعام بھی دیتے ہیں۔''

''تو کیا انعام کے پیسے بھی وہ تم سے لے لیتے ہیں؟''

''ہاں!'' اُس نے صرف اتنا ہی کہا اور اپنی لمبی لمبی مصنوعی پلکیں جھپکالیں اور نیچے اپنی اُدھڑتی ہوئی نیل پالش کی طرف دیکھنے لگی۔

اُس کی گز گز بھر کی گوری گوری ٹانگیں کئی ہفتوں سے ویکسنگ نہ کیے جانے کی وجہ سے ننھے ننھے سنہرے بالوں سے پٹی پڑی تھیں۔ اُس نے سر اٹھایا اور مجھے اپنی بھدی ٹانگوں پر نظریں جمائے دیکھ کر اس نے فوراً اپنی دونوں ٹانگیں ترچھی کر کے اپنی طرف سمیٹ لیں۔ اُس کے فربہ بدن سے اُس وقت خوشبوؤں کا ایک ایسا بھبکا اُٹھ رہا تھا جو میری نتھنوں کو اپنی طرف پوری شدت سے مائل کیے ہوئے تھا۔ یہ مہک اس کے جسم کی تھکاوٹ کی وجہ سے تھی یا شاید پسینے یا آنسوؤں کی وجہ سے تھی۔ یا پھر ہارمونل رساؤ کی وجہ سے جو ایک جوان عورت ہی کے جسم سے آسکتی ہے۔ اس میں ڈی او ڈورینٹ اور پرفیوم کی مصنوعی خوشبوئیں بھی شامل ہوگئیں تھی۔ اس کی گہری نیلی بینائیوں کے گرد آنکھوں کے غلافی جھے اُس وقت سُوجھ کے موٹے پھولے ہوئے سے لگ رہے تھے۔

جُولیہ سے یہ میری دوسری ملاقات تھی۔

میری پہلی ملاقات اُس سے بڑی ڈرامائی انداز سے ہوئی تھی۔ وہ اسکاؤٹ گرل تھی۔ وہ پیرس کے سب سے مہنگے اور پاش ایریا میں کام کرتی تھی۔ ہوسکتا ہے، اس کا اصلی نام کچھ اور ہو لیکن اُس نے مجھے یہی بتایا تھا۔ میں وثوق سے کچھ بھی نہیں کہہ سکتا کہ اُس نے جھوٹ کہا تھا یا سچ کہا تھا۔ لیکن اتنا تو تھا کہ اُس نے خود پر ڈھائے جانے والے مظالم کی داستان ہم سے سچ سچ بتادیا تھا۔ اُس کی حالت ایک ایسے قیدی کی تھی۔ جسے معلوم تھا کہ اُس سے ہمدردی کرنے والا شخص قید خانے میں ہے اور اب اس سے دوبارہ ملاقات نہیں ہو پائے گی۔

لیکن جب میں نے ہزاروں روپے خرچ کر کے اُس سے دوبارہ ملاقات کا انتظام کرلیا تو مارے خوشی کے اُس کی آنکھیں چھلک پڑی تھیں۔ اُس وقت میں نے اُس کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔ گناہوں کی آلائشوں سے پاک، شہر کی آلودگیوں سے دور کسی ساحلی علاقے کی ریت پر سیپیوں سے کھیلتی ہوئی ایک معصوم بچی وہاں موجود تھی۔ مادہ پرست دُنیا کے مکروفریب سے پرے، وہ اپنی آنکھوں میں کھلکھلا کر ہنس رہی تھی۔

وہاں ایک ایسی لڑکی موجود تھی، جس کا باپ دور سمندر کے ہولناک لہروں سے الجھتا ہوا مچھلیاں پکڑنے گیا ہوا تھا تاکہ اس کے بیوی اور چھوٹے چھوٹے بچے بھوک کے نذر ہیں۔

اُس نے اپنے بارے میں بتایا تھا۔

اُس کے سات بھائی بہن تھے۔ وہ سب سے بڑی تھی۔ اتنی بڑی کہ اُسے مرد کی محبت کا مطلب سمجھ میں آنے لگا تھا۔ وہ اپنی بالی عمر سے زندگی کی اُس سرحد میں داخل ہو چکی تھی، جہاں لڑکیاں اپنے جسم کے نہاں خانے میں کسی راجکمار کی دستک کا انتظار کرنے لگتی ہیں۔

تبھی سارکوزی نے آکر اس کے پھول سے ہونٹوں کو کھیل کھیل میں چٹکیوں سے مسل دیا تھا۔ اُسے بہت ہی اپنائیت کا احساس ہوا تھا۔ وہ اسے اپنا دل دے بیٹھی تھی۔ یہ سب کچھ اتنا آناً فاناً میں ہوا کہ وہ اپنا سب کچھ نچھاور کر بیٹھی تھی۔ ایسا کرتے وقت اُس نے ایک پل کو بھی ٹھہر کر اس کے انجام کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ شاید وہ اتنا جاذبِ نظر تھا۔ اس کی شخصیت اتنی رعب دار تھی کہ اُس کے سفید ہیٹ اور سفید یونیفارم کے آگے وہ بے بس ہوگئی تھی۔ اُس نے بتایا تھا کہ وہ نیوی مرچنٹ ہے۔

لیکن مسٹر پرویز فریب اتنا دلکش ہوتا ہے۔ اتنا سحر انگیز ہوتا ہے کہ انسان مچھلیوں کی طرح چارے کے اندر پوشیدہ کانٹے کو دیکھ نہیں پاتا۔ وہ اُس وقت تک مجھ سے کسی ضدی بچے کی طرح کھیلتا رہا جب تک کہ اُس کا جی نہیں بھر گیا۔ جب ایک سال کا عرصہ بیت گیا۔ تو وہ ایک دن مجھے میرے ساحلی گاؤں سے نکال کر شہر لے آیا۔ میں اُس وقت پورے پیٹ سے

تھی اور کسی بھی وقت بچہ پیدا ہو سکتا تھا۔ میں پیرس کی اجنبی اور انجان گلی کوچوں میں اس کے پیچھے لاچار بھاگتی رہی۔ ایک چیری ٹیبل نرسنگ ہوم میں بچے کی ڈلیوری ہوئی۔ میں نے ایک بیٹے کو جنم دیا تھا۔ میرا بیٹا لوئس جب ایک سال کا ہو گیا اور اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے لگا تبھی سارکوزی نے مجھے اس جہنم کی آگ میں دھکیل دیا۔

تب سے آج تک میں ممتا کی ماری اپنی اولاد کی خاطر مافیاؤں کے ہاتھوں ہر ظلم و ستم سہہ رہی ہوں۔ میں حقیقت میں اُن کی غلام بن چکی ہوں اور وہ ہمارے آقا ہیں۔ آج اس واقعے کو پانچ سال بیت چکے ہیں۔ چوبیں گھنٹے ان کی نگاہ مجھ پر رہتی ہے۔ وہ لوگ مجھے اپنے بچے سے ملنے کی اتنی دیر کی مہلت دیتے ہیں۔ جتنی دیر کے لیے تم ہزاروں روپے خرچ کر کے مجھ سے ملنے کی خاطر میرے پاس آتے ہو۔

لیکن تمہارے عاشق نے بھلا ایسا کیوں کیا؟

یہ سچ ہے کہ وہ مجھ سے دوبارہ نہیں ملا۔ اگر مل جاتا تو میں اُس کا خون کر دیتی۔

وہ مافیا جو اس فلیش ٹریڈ کے ریکٹ کو چلاتے ہیں۔ انھوں نے بتایا تھا کہ نیوی مرچنٹ تمہارا عاشق نہیں، وہ دراصل ایک پمپ ہے۔ اس نے ہم سے پانچ ہزار فرینک لے کر تمہیں بیچ دیا تھا۔ تم ہمارے لیے انڈے دینے والی صرف ایک مرغی بھر ہو۔ کھاؤ پیو اور انڈے دیتی رہو۔ اس سے زیادہ کی سوچنا بھی مت ورنہ تمہارے چہرے پر تیزاب پھینک دیا جائے گا تمہارا چہرہ جل کر اتنا خوفناک ہو جائے گا کہ اسے دیکھ کر تمہارا بیٹا بھی ڈر کے مارے بھاگ کھڑا ہو گا۔ تم اتنی بدصورت ہو جاؤ گی کہ خود اپنی شکل آئینے میں دیکھنے کی ہمت نہیں جٹا پاؤ گی۔ تمہارے لیے بس یہی اچھا ہے کہ انڈے دیتی رہو اور ہمارے دھندے کے بیچ میں اپنی ٹانگیں مت اڑاؤ۔ ہمارے راستے میں جو بھی آئے گا، اس کا اتنی آسانی سے صفایا ہو جائے گا کہ تم کبھی سوچ بھی نہیں سکتی۔ ہم انٹرنیشنل لیول پر کام کرتے ہیں۔ دُنیا کی کسی بھی ملک کی پولیس ہمارا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتی۔ ہمارے اس کام میں بڑے بڑے ڈپلومیٹ اور پالیٹیشین بھی شامل ہیں۔

''جولیہ'' میں نے اُسے پورے اعتماد میں لے کر کہا: ''تم ان کی باتوں سے ذرا بھی مت گھبرانا۔ وہ سب تمہیں ڈرانا چاہتے ہیں۔ تم بے خوف رہنا۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تم بہت جلد ان کے چنگل سے آزاد ہو جاؤ گی۔ تمہیں تمہارا اپنا بیٹا بھی مل جائے گا۔ بس تم صرف اتنا کرو کہ میرے موبائل میں کچھ ویڈیو ریکارڈنگ ہیں۔ اسے کسی اندھیرے گوشے میں لے جا کر دیکھو اور بتاؤ کہ ریکٹ کا سرغنہ فلپس ان میں سے کون ہے؟ کیا وہ ان ویڈیو میں موجود ہے؟''

جولیہ کو حالات نے سب کچھ سکھا دیا تھا۔ اُس نے سی سی ٹی کیمرے کے دائرہ کار سے بچا کر موبائل آن کیا اور دور سے ہی اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ فلپس کو ٹیپ کرنا اب بہت آسان ہو گیا تھا۔ میں نے ایمنسٹی انٹرنیشنل کے اینٹی ہیومن ٹریفکنگ برانچ کے ایک جری آفیسر کو اُس جگہ کے بارے میں کچھ سراغ دے دیا تھا، جہاں بہت ہی ٹاپ ماڈل کی آڑ میں جسم فروشی کا دھندہ کافی وسیع پیمانے پر اور بڑے زور وشور سے چل رہا تھا۔

پیرس کے ایفل ٹاور سے نیچے اُترنے کے بعد میں نے سیٹھ گردھاری پٹیل کو ایک ہوٹل میں ڈراپ کر کے تھکا ہوا لوٹ رہا تھا۔ شب کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ تبھی اچانک ایک ماڈل میرے سامنے زمین پر گرے اپنے پرس کو اُٹھانے کے لیے جھکی تھی اور جوں ہی میں نے اس کی پرس اُٹھانے میں مدد کرنے کی کوشش کی۔ اُس نے بہت ہی شہوت انگیز اشارے کرتے ہوئے اپنی انگلی کے گرد اپنے سرخ ہونٹوں کا حلقہ بنا کر خشکی دور کرنے کے لیے زبان پھیری تھی۔

ایسا کرتے وقت اس کی نظریں مجھ پر سے ایک ساعت کے لیے بھی نہیں ہٹی تھیں۔ میرے بدن میں سیہرن سے دوڑ گئی۔

میں رُکا اور اُسے دیکھتا رہ گیا۔

اُس نے بڑے معنی خیز انداز سے مجھے آنکھ مارتے ہوئے دریافت کیا۔ ''اسکاؤٹ؟''

میں نے بھی کچھ سمجھے بغیر کہہ دیا۔

''ہاں! اسکاؤٹ''

اُس نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ ''میرے ساتھ ساتھ چلتے رہو۔''

ایک اندھیری گلی میں مڑتے ہی وہاں لمبی کار ہمارا انتظار کر رہی تھی۔

اُس نے ایک عالی شان کمرے کے اندر داخل ہوتے ہی کہا۔

''بیس ہزار''

میں نے گردھاری پٹیل کو فون پر ساری بات مختصراً بتا دی۔ اُس نے کہا ''پندرہ ہزار'' میں نے بھی کہہ دیا۔

''پندرہ ہزار''

''چلے گا۔ لیکن یہ بتاؤ کہ تم فون پر کس سے باتیں کر رہے ہو؟''

''سیٹھ گردھاری پٹیل۔ میرا کلائنٹ''

''تم میرے کلائنٹ ہو اور وہ تمہارا کلائنٹ، کیسے؟''

''میں ایک انٹرپریٹر ہوں۔ سیٹھ فرانسیسی زبان نہیں جانتا ہے۔ لیکن اس کے پاس مال ہے، بہت سارا مال۔ جس طرح تمہارے پاس مال ہے۔ تم دونوں

مالا مال ہو۔ قدرت نے تمہیں حسن کی دولت دی ہے اور سیٹھ کو روپوں کی دولت دی۔ تم دونوں اپنا کام کرو۔ میں کرتا ہوں آرام.....''

جولیا نے باہر آ کر خوش رنگ لباس زیب تن کرنے کے بعد اپنے گہری تراش کے گریبان کو درست کرتے ہوئے کہا۔''میں تو کسی مجبوری کے تحت یہ کام کرتی ہوں لیکن یہ سب تم کس لیے کرتے ہو؟''

''میں پاپی پیٹ کے لیے کرتا ہوں۔'' میں نے اپنے پیٹ کی طرف ہاتھوں کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اُس کے چہرے سے لگا کہ وہ کچھ سمجھی نہیں یا شاید سمجھ گئی ہے تو کچھ بتانا چاہتی ہے، لیکن بتا نہیں پا رہی ہے۔

میں نے سوالیہ نگاہوں سے اُسے دیکھا اور ہاتھوں کے اشارے سے پوچھا۔''کیا معاملہ ہے؟''

اتنا دریافت کرتے ہی اُس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ وہ ضبط نہ کر سکی اور زار و قطار آنسو جاری ہو گئے۔ یہ منظر دیکھ کر میرا دل پسیج گیا۔ میں اس کے قریب کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

اُس کے منہ سے پہلا جملہ نکلا۔

''میرا ایک معصوم بچہ ہے۔ جسے ظالموں نے مجھ سے دور کسی جگہ قید کر رکھا ہے۔ اُس کے عوض یہ لوگ مجھ سے یہ گناہوں کا دھندہ کرواتے ہیں۔ میں یہ سب اپنی خوشی سے نہیں کرتی ہوں۔ میری روح کو ہر روز کوئی نہ کوئی نیا زخم دے جاتا ہے۔ آج تم نہیں ملتے تو کوئی دوسرا مرد مجھے اپنے پیروں تلے روند جاتا۔ تم مجھے شریف آدمی معلوم ہوتے ہو، اس لیے میں تم سے اپنی بات بتا رہی ہوں کہ شاید تم میری کچھ مدد کر سکو۔ میں اندر سے بالکل ٹوٹ چکی ہوں۔''

آغاز میں مجھے یہ سب من گھڑت کہانی معلوم ہوئی۔

لیکن تبھی ہماری موجودگی میں تین دبنگ قسم کے غنڈے آئے اور اُسے کسی گذشتہ کلائنٹ کی شکایت کی وجہ سے ڈانٹنا شروع کر دیا۔ اس کے جواب دینے پر بڑی درشتی سے ان میں سے ایک نے کہا۔''ہم سے زبان لڑاتی ہے''۔ ایک موٹی سی دل خراش گالی دی اور طمانچوں سے اُس کا منہ لال کر دیا۔ وہ سر سے پاؤں تک ڈر سے کانپ رہی تھی۔

سیٹھ نا جانے کب باتھ روم میں گھس گیا تھا۔ وہ شور کم ہوتے ہی نکل کر مجھے گھسیٹتا ہوا وہاں سے باہر لے آیا۔ اُس ملاقات میں میں بھی مجبور تھا۔ باہر جاتے جاتے میں اُسے صرف مڑ مڑ کر بے بسی سے دیکھتا رہ گیا تھا۔

وقت گذرتا رہا۔ مجھے لگا تھا کہ اس سے دوبارہ ملاقات نہیں ہو پائے گی۔ میں سیاحوں کو لے کر جب بھی فرانس جاتا، پیرس کے اُس ماڈرن بازار حُسن میں ضرور جاتا، مبادہ جولیہ سے ملاقات ہو جائے۔

وہ اسکاؤٹ گرل تھی۔

میں اپنے دل ہی دل میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ سوئے اتفاق سے کسی نے مجھ سے آ کر کہا۔''اسکاؤٹ گرل؟''

میں نے کہا۔''ہاں!''

وہ مجھے لے کر ایک دیوار کی آڑ میں لے گیا، جہاں اندھیرے میں کچھ لڑکیاں کلائنٹ کا انتظار کر رہی تھیں۔ چند چار لڑکیوں کے ساتھ وہاں جولیہ بھی کھڑی تھی۔ اُس نے مجھے شاید نہیں پہچانا تھا۔ یا شاید پہچان ظاہر کرنا نہیں چاہتی تھی۔ میں نے اُس کی طرف اشارہ کیا۔

''بیس ہزار''

میں نے کہا۔''چلے گا۔''

عالی شان عمارت کے ویسے ہی کسی کمرے میں ہم دونوں کو قسمت نے ایک بار پھر آمنے سامنے لا کھڑا کیا تھا۔ آج کوئی سیٹھ میرے ساتھ نہیں تھا۔

جولیہ میرے سامنے مادرزاد برہنہ کھڑی تھی۔

میں اس کی طرف اپنی پیٹھ کر کے کھڑا ہو گیا۔ میں نے کہا۔''جولیہ! میں تمہیں اس کام سے آزاد کرانے آیا ہوں۔ جاؤ اور جا کر اپنا تن کپڑے سے ڈھانپ لو۔'' وہ مڑی تو مجھے آئینے میں دیکھ کر جے پور کے شاہی میوزیم میں رکھا آدم قد گلدان کا اُبھار یاد آ گیا۔

اُس نے کچھ اس انداز سے اپنی بڑی بڑی اداس آنکھوں سے میری طرف دیکھا جیسے میری باتوں کا اسے یقین نہ ہو۔

''کاش! میں تمہاری باتوں پر یقین کر پاتی!''

''تم سے پہلے بھی کئی دیوانے یہ بات کہہ چکے ہیں۔ ٹامس نے میری خاطر اپنی جان جوکھم میں ڈال لی تھی۔ وہ فلپس کے گرگوں سے بھڑ گیا تھا لیکن آخر کار اسے اپنے اس دیوانے پن کی ضد چھوڑنی پڑی۔ اُسے فلپس کے غنڈوں نے بری طرح زدوکوب کر کے شہر سے دور کسی ویرانے میں پھینک آئے تھے۔''

''جولیہ! میں کچھ نہیں جانتا۔ میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ تم مظلوم ہو اور مظلوم کی مدد کرنا میرا فرض ہے۔''

''تم جانتے ہو، اس کا انجام؟''

جولیہ نے اپنا لباس زیب تن کرنے کے بعد اس کی آخری زپ کھینچ کر بند کرتے ہوئے میری طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ اُس کے لہجے میں قطعیت تھی اور اپنی نظروں کے ترازو پر رکھ کر دل کے کانٹے سے وہ میرے ارادے میں کتنا وزن ہے، اُسے ٹٹول رہی تھی۔''

''ہاں! میں خوب جانتا ہوں۔ اپنی جان سے بھی ہاتھ دھونا پڑ سکتا ہے۔'' میں نے سپاٹ لہجے میں

کہا۔

''اگر اتنے دیوانے ہو تو آؤ میرے ساتھ.....اس تاریک گوشے میں چلو.....''

میرے قدموں میں سبک سی لغزش ہوئی تھی لیکن پھر مجھے خود پر نا جانے کہاں سے ایک غیر معمولی اعتماد آ گیا۔ میں حیران تھا کہ وہ مجھے تاریک گوشے میں کیوں لے جا رہی ہے۔ اس نے اپنے پیڈیڈ برا کے نچلے سرے سے اپنی لانبی لانبی انگلیوں کے خوبصورتی سے تراشے ہوئے ناخنوں کی مدد سے ایک پرچی نکالی اور اپنے سرخ گلوس ہونٹوں کو میرے کانوں کے نزدیک لا کر سرگوشی کی تو ایک سنسنی سی میرے پورے جسم میں دوڑ گئی۔ ریڈیو ٹیکسی کے بل کی پشت پر اس فلیش ٹریڈ کے سرغنہ کا نام و پتہ کا آئی لائنر سے لکھا ہوا تھا۔

تبھی دروازے پر ہلکی سے دستک ہوئی اور ایک زوردار آواز کے ساتھ دروازہ پوری طرح کھل گیا تو جولیہ نے اپنی حاضر دماغی کا ثبوت دیتے ہوئے اپنے پیوستہ ہونٹوں کو مجھ سے الگ کرتے ہوئے بڑے ہرجائی پن سے میرے ہونٹوں پر لگی لپ اسٹک صاف کر لینے کا اشارہ کیا۔

''بس بس! اب ٹائم ختم ہو گیا۔'' سامنے فلیس کے گرگے کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک نے بڑے تحکمانہ لہجے میں مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

اس قلیل ملاقات نے میرے سینے میں ایک ہلچل سی پیدا کر دی تھی۔

مجھے اس بار پیرس میں ایک ہفتہ قیام کرنا تھا۔ جولیہ نے جب سے مجھے سرغنہ کے نام کی پرچی دی تھی، تب سے میں ایک پل بھی چین سے نہیں بیٹھا تھا اور میرا دماغ مسلسل اس کی رہائی کے منصوبے بنا رہا تھا۔ خیالوں ہی خیالوں میں اسے کئی بار رہا بھی کرا چکا تھا۔ لیکن شیخ چلی کی طرح خیالی پلاؤ پکانے اور عملی کار روائی میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ سوچ سوچ کر میرا ذہن ماؤف ہوتا جا رہا تھا۔

چار دن بیت چکے تھے۔

بات ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھی تھی۔ میں نے قصداً جولیہ سے ملنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ لیکن اس دوران ہر شام دیر رات تک اس کے علاقے میں کسی نہ کسی بہانے سے میں نے نگاہ رکھی ہوئی تھی۔ میرے لیے ایک حیرانی کی بات یہ تھی کہ اس دوران جولیہ کا کوئی اتہ پتہ نہ تھا۔ کئی بار میرے ذہن میں خیال آیا۔ مبادا راز فاش نہ ہو گیا ہو؟ سرغنہ کو خبر ہوتے ہی اس نے اسے نظر بند کر دیا ہوگا۔ اسی قسم کے بیہودہ اور فضول خیالات نے مجھے پریشان کر رکھا تھا۔

ایک شام میں بازار حسن کے اس سنسان علاقے سے بھاری قدموں کے ساتھ لوٹ رہا تھا کہ میرے موبائل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس فون پر ہونے والے گفتگو کے دوران میرے باس (Boss) کو میری باتوں سے میری ذہنی کیفیت کا اندازہ لگانے میں ذرا بھی دیر نہ لگی۔ جب سیٹھ گردھاری پٹیل نے وجہ دریافت کی تو میں خود کو روک نہیں سکا اور اُس سرغنے کا نام و پتہ نوٹ کرا دیا۔

''سیٹھ جی!'' میں نے بڑی خود اعتمادی کے ساتھ کہا۔ ''ویسے تو میرے آہنی ارادے سے مجھے کوئی بھی ہٹا نہیں سکتا۔''

پھر تھوڑے توقف کے بعد میں نے کہا۔ ''لیکن اگر خدانخواستہ کوئی بات ہو جائے تو یہ نام اور پتہ یاد رکھیے گا۔ یہی وہ سرغنہ ہے جو فلیش ٹریڈ کا انٹرنیشنل ریکٹ چلا رہا ہے۔ یہ ایک زاؤنسٹ ہے اور بظاہر بنی اسرائیل کے قوم کا مذہبی پیشوا ہے لیکن ہر وقت عورت ہی اس کا اوڑھنا اور عورت ہی اس کا بچھونا رہتی ہے۔ وہ کروٹ کروٹ حسیناؤں کے گداز بدن کے لمس کا شیدائی ہے۔ ہمہ وقت ہیروئن کی تسکری میں اس نے بے حساب دولت کمائی ہے اور دنیا کے ہر ملک میں اس کے گرگے دن رات چوبیس گھنٹے سرگرم عمل رہتے ہیں۔''

دفعتاً میرے فون میں گھڑگھڑاہٹ ہونے لگی اور کچھ فضول سی آوازوں کے بعد فون بند ہو گیا۔

ایک گھنٹہ بھی نہیں گذرا تھا کہ میرے پاس فون آ گیا۔

''آپ جو کوئی بھی ہوں اور جہاں بھی ہیں۔ اپنی جگہ سے ہلنا نہیں، آپ سے جلد ہی کوئی ملاقات کرے گا۔'' آواز میں کڑک تھی اور ایسی رعب دار آواز کہ میں سوچنے پر مجبور ہو گیا۔

''یاالٰہی ماجرہ کیا؟''

کہیں جولیہ کے سرغنہ کو نہ معلوم چل گیا ہو۔ میں اسی تشویش میں مبتلا ہو کر موبائل فون کو فلپ کے اندر ڈال کر اپنی جیب میں رکھ کر ہوٹل کے سنسان کمرے میں بیٹھا ہی تھا کہ تیزی سے دستک ہوئی۔

''کون؟''

میں نے ہوٹل کا اسٹوارڈ سمجھ کر اندر ہی سے کہہ دیا۔ ''دروازہ کھلا ہے اندر آ جاؤ؟''

دروازہ کھلا۔ ایک پُراسرار شخص اندر داخل ہوا۔ اُس نے مصافحہ کے لیے میری طرف اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

''میں انٹرپول پولیس کا رسکیو آفیسر ہوں۔''

آپ کو یہ جان کر یقیناً خوشی ہوگی کہ آپ نے انجانے میں ایک انتہائی سنگین مسئلہ حل کرنے میں ہماری مدد کی ہے۔ انڈیا میں آپ نے فون کر کے جس کی تفصیلات دی ہے۔ وہ ایک انٹرنیشنل ہیومن ٹریڈ نگ کی ریکٹ کا سرغنہ ہے۔ ہماری ٹیم اس نام کے ہر

فون کو کمپیوٹر کے ذریعے ٹیپ کر رہی ہے۔ اگر آپ کا بتایا ہوا پتہ صحیح نکلا تو کئی بڑے جرائم پر انکوش لگانے میں ہم کامیاب ہو جائیں گے۔ آپ اسی وقت اپنا سامان وغیرہ جو کچھ بھی ہے، سب یہیں چھوڑ کر فوراً ہمارے ساتھ چلیں کیوں کہ اب آپ کی جان کو یہاں خطرہ ہے۔''

اُس رات، انٹر پول پولیس کے ہیڈ کوارٹر میں مجھے ریسکیو ٹیم کے مزید دو افسران سے ملایا گیا۔ ان میں سے ایک سیاہ فام شخص تو نائیجیریائی تھا لیکن دوسرا شخص انڈین سردار یعنی سکھ تھا۔ یہ دیکھ کر مجھے قدرے راحت محسوس ہوئی۔ اس کے بائیں گال پر داڑھیوں سے ڈھکا ہوا ایک مسّہ تھا۔

ملاقات کے بعد مجھے ایک کمرے میں کھانے اور سونے کے لیے بھیج دیا گیا۔

میں رات بھر یہ سوچتا رہا کہ ہو نہ ہو وہ مسّہ والا سردار میری یونیورسٹی کا ترلوچن سنگھ ہی ہے۔ ترلوچن ہمارے جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے جہلم ہوسٹل میں میرے دو چار کمرے کے بعد والے کمرے میں سیکنڈ فلور پر رہتا تھا۔ ہم سب میس میں ایک ساتھ کھانا کھایا کرتے تھے اور اس دوران گپ شپ بھی مارا کرتے تھے۔ وہ انڈین پولیس سروس کی تیاری کر رہا تھا جس کا امتحان یونین پبلک سروس کمیشن (UPSC) کنڈکٹ کیا کرتی تھی۔ پھر ایک روز اچانک پتہ چلا کہ ترلوچن کا سلیکشن راء یعنی ریسرچ اینڈ انالیسس ونگ میں ہو گیا ہے۔ یہ ایک خفیہ شعبہ تھا۔ لہٰذا اُس نے کسی کو نہیں بتایا اور چپکے سے ایک دن انڈر گراؤنڈ ہو گیا تھا۔ اس کے بائیں گال پر بڑا سا مسّہ تھا جس کی نسبت سے ہم بھی دوست یار پیار سے اسے ''مسخرہ'' کہا کرتے تھے۔

آدھی رات گذر جانے کے بعد اُسی مسّے والے سردار نے مجھے میس ہال سے باہر مردانہ واش روم میں لے جا کر سرگوشی میں بتایا:

''تو اپنا پرویز خان ہے نا جہلم ہوسٹل والا؟''

میں یہ سُن کر ایک دم سے دنگ رہ گیا۔ میرے منھ سے حیرت سے نکلا۔

''ترلوچن؟ مسخرہ؟'' وہ ہنس پڑا اور ہاں میں سر ہلاتا ہوا منھ سے کچھ نہ بولا۔

''تو اور انٹر پول پولیس میں؟ یہ سب کب اور کیسے ہوا؟'' اُس نے آنکھوں سے اشارہ کیا کہ سی سی ٹی کیمرے میں ہماری باتیں بھی ریکارڈ ہو رہی ہیں۔

میں خاموش ہو گیا۔

مجھے اندر سے ایک انجانی سی خوشی محسوس ہو رہی تھی۔ قدرت کا میں شکر ادا کر رہا تھا۔ ایک مثبت توانائی میرے پورے رگ و پے میں دوڑ گئی تھی۔

دوسرے دن، رات کے چار بجے اچانک دروازے پر دستک ہوئی اور میں ہڑبڑا کر بستر سے اُٹھ گیا۔ ترلوچن نے بتایا کہ دبش دی جا چکی ہے اور سارے گینگ کو سرغنہ سمیت حراست میں لے لیا گیا ہے۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے تھمس اپ کا خفیف کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''جولیہ نیچے HSBC کے اے ٹی ایم پر تمہارا انتظار کر رہی ہے اور ہاں اسے دیکھ کر چکرانا نہیں وہ سر سے پاؤں تک سیاہ برقعے میں ملبوس ہے۔''

اس کی اردو دانی کا آج بھی میں قائل تھا۔ اُس کی یہی اردو فارسی کی تعلیم نے اسے راء جیسے خفیہ محکمے میں آسانیاں فراہم کرا دی تھیں۔

لیکن یہ سب کچھ اتنا آناً فاناً میں ہوا کہ میرے حواس باختہ ہو کر رہ گئے تھے۔ میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ سب مسائل اتنی آسانی سے حل ہو جائیں گے۔ لیکن کہتے ہیں نا کہ جب کوئی بات بننا ہو تو راستے خود بخود ہموار اور ماحول خود بخود سازگار ہوتے چلے جاتے ہیں۔ میرے مولا نے میرے دل کی فریاد سن لی تھی۔

اپنے طے شدہ منصوبے کے مطابق جب میں HSBC کے اے ٹی ایم بوتھ پر پہنچا تو ترلوچن سنگھ کی پلاننگ دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ چند ہی سیکنڈ کے بعد ایک چمچماتی ہوئی ٹیکسی سے ایک لمبی تڑنگی سی نقاب پوش خاتون نکلی جو اپنے حلیے اور لگیج وغیرہ سے بیرونی سیاح معلوم ہوتی تھی۔ اے ٹی ایم میں اپنے کلاچر (Clucher) لے کر داخل ہونے والی خاتون کوئی اور نہیں بلکہ یہ جولیہ تھی۔

تبھی جولیہ نے بتایا۔'' فرانسیسی حکومت کے حجاب پر پابندی لگانے کے خلاف مسلم خواتین کا کل ایک زبردست احتجاجی مظاہرہ تھا۔ نقاب پوش خواتین وزیر اعظم کے نئے قانون نافذ کرنے کے خلاف نعرے بلند کر رہی تھیں، ان کا قافلہ ہماری اسٹریٹ سے ہوتا ہوا شاہی ایوان کو جا رہا تھا۔ تبھی انٹر پول کے افسران نے مقامی پولیس کے ساتھ ایک دم سے ہمارے اڈّے پر دھاوا بول دیا۔ اس کے ساتھ ہی ہر طرف چیخ و پکار مچ گئی۔ تبھی ایک انڈین افسر مجھے نقاب پہنا کر وہاں سے باہر نکال لایا اور یہ اسی انڈین افسر نے مجھ سے کہا تھا کہ میں اس اے۔ ٹی۔ ایم پر رات کے چار بجے کسی سیلانی کے بھیس میں ٹیکسی سے آ کر تمہارا انتظار کروں۔''

میرے دریافت کرنے پر اُس نے بتایا تھا۔

''آپ کی رہائی جس شخص کی وجہ سے ممکن ہو پائی ہے، وہ کوئی اور نہیں میرا یونیورسٹی کا ساتھی ہے''...... یہ کہتے کہتے میں نے دیکھا اس پولیس افسر کی آنکھیں پل بھر کو نم ہو گئی تھیں اور آواز میں ہلکی سی

کپکپاہٹ در آئی تھی۔ اُس نے خود کو سنبھالا اور اپنے جذبات کو قابو میں کرتے ہوئے کہا۔

''آپ مجھے نہیں جانتی۔ لیکن میں سب جانتا ہوں۔ وہ تمہیں بہت خوش رکھے گا۔

اور... ہاں! وہ میرا یار ہے پرویز خان، وہ ایک سچا مسلمان ہے۔ میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ اپنی جان کی بازی لگا سکتا ہے تمہاری حفاظت کی خاطر---- وہ اپنا دم تو توڑ سکتا ہے لیکن اپنا وعدہ نہیں توڑ سکتا۔....'' یہ کہتے ہوئے جولیہ نے اپنے رُخ سے نقاب اُٹھایا تو اُس کی آنکھوں کی عجیب دل کو چیر دینے والی کیفیت سے متاثر ہو کر میں نے اس کے سر کو اپنے کندھوں کا سہارا دے دیا۔

لیکن یہ کیا------ میں حیران تھا کہ جولیہ جیسی پختہ ارادے والی لڑکی بھی کبھی گریہ کر سکتی ہے!

جلتی ہوئی موم شمع کی مانند اس کی سرخ ڈورے پڑی آنکھوں سے گرم گرم آنسو نکل کر میرے ہاتھوں پر ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔ اُس دم مجھے ایسا محسوس ہوا گویا جولیہ کے قلب کا صیقل ہو گیا ہو اور آنکھوں کے رستے برسوں کی جمی ہوئی حالات کے جبر کی آلودگیاں ڈھل ڈھل کر باہر نکل آئی ہوں۔

یکا یک، جذبات سے مغلوب ہو کر وہ میرے قدموں پر جھک سی گئی اور کہنے لگی:

''آپ نے مجھے نئی زندگی دی ہے۔ میری یہ زندگی آپ کا قرض ہے جسے میں کبھی اتار نہ سکوں گی۔''

میں نے فوراً اسے دونوں بازوؤں سے تھام کر اوپر اٹھالیا۔

''ارے، ارے، آپ یہ کیا کر رہی ہیں؟ آپ کا مقام یہ نہیں ہے۔ بلکہ مجھے تو ابھی ایک اور قرض اتارنا ہے۔'' میں نے اس کی حیران آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''جب تک تمہیں تمہارا بیٹا واپس نہیں مل جاتا..... میں چین سے نہیں بیٹھوں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے!''

وہ مجھے اپنی شبنمی آنکھوں سے دیکھنے لگی۔ اس کی شکر گذار آنکھوں میں نمی تھی۔ اُس وقت مجھے اُن آنکھوں میں مریم کی سی ازلی تقدیس دکھائی دے رہی تھی۔

جب میں نے جولیہ کو یہ یقین دلایا کہ ترلوچن اپنا دوست ہے۔ اُس کے بیٹے کی بازیافت میں وہ ہماری ضرور مدد کرے گا اور جب تک اس کا پانچ سالہ بیٹا نہیں مل جاتا تب تک کے لیے میں نے انڈیا جانے کا ارادہ ترک کر دیا ہے۔''..... یہ سنتے ہی اس کے اداس ہونٹوں پر مسکراہٹ کی ایک سبک سی کرن دوڑ گئی۔

اس کے بعد ہمارے درمیان خاموشی نے کچھ لمحے کے لیے اپنے پنکھ پھیلا دیئے۔ وہ اپنے مستقبل کے خواب بُننے میں کچھ دیر کے لیے کہیں گم ہو گئی تھی ---- تھوڑے توقف کے بعد میں نے اپنا ارادہ ظاہر کیا تو وہ ایک دم خوشی سے اچھل پڑی۔

''جولیہ! میں تمہارا وہ ساحلی گاؤں دیکھنا چاہتا ہوں، جہاں تمہاری زندگی میں شباب کی کلیوں نے پہلے پہل مہکنا سیکھا تھا، جہاں تمہارے دل نے اول اول گنگنانا سیکھا تھا..... اور جہاں تمہارے پھول ہونٹوں نے سب سے پہلے مسکرانا سیکھا تھا۔ تم دکھاؤ گی نہ مجھے وہ سب... میں تمہارا وہ الھڑ پن پھر سے دیکھنا چاہتا ہوں؟''

میں نے جب اپنی نرم نظروں سے اسے دیکھا تو محسوس ہوا جیسے دور بہت دور کہیں بادلوں کی چھاؤں میں کوئی بیج انکورنے کے لیے بھربھری مٹی کو ہٹا کر نمودار ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔

''آؤ! ہم چلیں اُس گاؤں کی طرف----!''

یہ سنتے ہی معاً جولیہ کے اندر کوئی ہرنی سی کلانچیں بھرنے لگی۔ اس نے حوا کی ازلی معصومیت کے ساتھ بڑھ کے میرا ہاتھ تھام لیا اور قدم سے قدم ملا کر چلنے لگی۔

''لیکن، یہ کیا؟''

میں نے اس کے سیاہ نقاب والے لباس کی طرف دیکھ کے اس کے بارے میں دریافت کیا تو اس کا جواب سن کر بالکل دنگ رہ گیا۔

اس نے کالے رنگ کے سلکی نقاب کے دامن کو بڑے شوق سے اپنے دونوں ہاتھوں سے دیکھاتے ہوئے کہا۔

''یہ محض ایک لباس نہیں۔ بلکہ میری عزت نفس کا ایک حصہ ہے۔ کل اسے پہننے کے بعد پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ اب تک میرا بدن ہی نہیں بلکہ روح بھی ننگی تھی۔ اسے پہننے کے بعد مجھے پہلی بار محسوس ہوا ہے گویا میں کسی سلطنت کی ملکہ ہوں۔''

اس نے تھوڑے توقف کے بعد مصمم ارادے کے ساتھ کہا۔

''اب میں اسے کبھی اپنے تن سے جدا نہیں کروں گی۔ میں ہمیشہ حجاب استعمال کروں گی۔ اسے زیب تن کرنے کے بعد ہی مجھے ایک خاص قسم کے تحفظ کا احساس ہوا ہے۔ تم مرد ایسی باتوں کو کبھی محسوس نہیں کر سکو گے۔''

میں نے اسے بتایا کہ پروفیٹ محمدؐ نے طلوع اسلام کے وقت ایمان لانے والی عورتوں سے یوں ہی نہیں کہا ہو گا کہ----------

''جب تم اپنے گھروں سے باہر نکلو تو اپنے جسم پر کوئی ردا ڈال لیا کرو تا کہ تم میں اور بازار کی دوسری عورتوں میں لوگ فرق کر سکیں۔''

میری بات سن کے جولیہ استعجاب سے مسکرائی اور پھر رخ پر حجاب ڈال کر میرے ہمراہ چل پڑی۔

افسانہ

شہادت

آدم شیر

وہ ہر رات وہیں کھڑی ہوتی جہاں اس وقت کھڑی تھی۔ سردی ہو یا گرمی کھری چاندنی ہو یا دھند کے بادل چھائے ہوں۔ حتیٰ کہ بارش بھی ہو رہی ہو تو وہ مزنگ چوک میں مچھلی والی دکان کے ساتھ نیم تاریکی میں کھڑی رہتی۔ جہاں سڑک پر جلنے والے بجلی کے بڑے بڑے قمقموں کی تھوڑی تھوڑی روشنی اس تک پہنچتی رہتی۔ شاید اسی لیے وہ یہاں کھڑی ہوتی کہ چوک کے چاروں اور سے وہ نظر آ سکے۔ لیکن واضح طور پر دیکھنے کے لیے اس کے پاس جانا پڑے۔ مجھے لگتا ہے کہ وہاں کھڑے ہونے کی ایک وجہ تو تلی مچھلی بیچنے والوں کی دکان تھی، جہاں بھری جیب والے ہی آتے ہیں۔ دوسری وجہ شاید یہ بھی تھی کہ اسی چوک میں بسیں بھی غیر قانونی طور پر رُکتیں، جن میں اکا دُکا مسافر سوار ہوتے اور اُترتے بھی تھے۔ میں ہر رات دفتر سے دو بجے چھٹی کے بعد اس جگہ جاتا۔ مچھلی والی دکان کے اُس طرف وہ کھڑی ہوتی۔ اس طرف میں چھپڑ ہوٹل کی فٹ پاتھ پر پڑی میزوں میں سے ایک میز پر بیٹھتا۔ میں پہلے کھانا کھاتا، پھر چائے پیتا۔ آخر میں ایک سستا سا سگریٹ سلگا لیتا جس سے مزید کئی سگریٹ سلگ جاتے اور چوری چوری اُسے دیکھتا رہتا۔ میں اس سے ایک انجانی سی اپنائیت محسوس کرتا تھا۔ اس کے احساس کا مجھے علم نہیں۔ کبھی کبھی تو کوئی نہ کوئی جلد ہی اسے ساتھ لے جاتا۔ کبھی کبھی خریدار کی آمد میں دیر ہو جاتی۔ گاہک نہ ملنے کی صورت میں وہ انتظار کی طویل گھڑیاں عام لڑکیوں کی طرح اِدھر اُدھر ٹہل کر کاٹتی، نہ بیٹھ ہی جاتی۔ بلکہ بند دکان کے جستی دروازے کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑی رہتی۔ میں نے تو کم از کم اسے ہمیشہ ایسے ہی کھڑے دیکھا۔ ایسے میں وہ بڑی سخت جان لگتی تھی۔ اسے یوں اتنی دیر کھڑی دیکھ کر تو میرے اپنے پاؤں دُکھنے لگتے مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوتی۔ یونہی کھڑی رہتی کالا دوپٹہ اوڑھے...... کالے دوپٹہ کے ساتھ اس کا گورا مگر سپاٹ چہرہ بڑا بھلا لگتا لیکن اس کی بھوری بھوری آنکھیں جن پر کالی ہونے کا گماں ہوتا تھا وہ گہرے گڑھوں جیسی تھیں جنہیں دیکھ کر مجھے رگ و پے میں سرد لہر سی دوڑتی محسوس ہوتی۔ اس کے کالے دوپٹہ کے علاوہ ایک اور کالی چیز تھی جو کبھی نہ بدلی...... کالی شلوار اور قمیص...... جیسے ابھی ماتم سے اٹھ کر آئی ہو یا جیسے ابھی کسی کے چالیسویں میں جانے کے لیے تیار ہوئی ہو۔ پتا نہیں اسے کالے رنگ سے کیوں محبت تھی۔ حالانکہ وہ خود گوری تھی۔ اس کا پرس بھی کالا سیاہ تھا جس پر وہ ہر وقت ایک ہاتھ ٹکائے رکھتی جیسے اس میں سونا ہو یا پھر سونے سے بھی قیمتی شے جیسے خطرہ ہو کوئی چھین کر بھاگ نہ جائے۔ اس کا بڑا سا کالا پرس دیکھ کر مجھے پیرس کی تنگ گلیوں میں کھڑی گوری گوری فاحشائیں یاد آتیں، جو ہر وقت اپنے پرس میں پستول رکھتی تھیں۔

اس رات بھی میں معمول کے مطابق فٹ پاتھ پر پڑی میز پر بیٹھا سگریٹ کا دھواں اُڑا اُڑا کر تخیل کے گھوڑے دوڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ بھی حسبِ معمول اپنی جگہ پر کھڑی پیٹ کا ایندھن بھرنے کے لیے خریدار کا انتظار کر رہی تھی۔ پھر جیسے انتظار کی طویل اور کٹھن گھڑیاں ختم ہو گئیں۔ ایک کار اس کے پاس آ کر رُکی۔ کار میں سے دو افراد اُترے۔ ان کے جسموں پر وہ والا لباس تھا جسے دیکھ کر عام آدمی راستہ بدل لیتا ہے۔ وہ چند لمحے اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد اُس کے پاس گئے۔ تینوں آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ مجھے نہیں پتا کیا باتیں ہو رہی تھیں۔ پھر ہلکی ہلکی آوازیں آنے لگیں...... پھر آوازیں بلند ہو گئیں......اور پھر بلند تر ہوتی گئیں۔ پل بھر میں کچھ لوگ ان تینوں کے قریب جمع ہو گئے۔ وہ سب سے بے پروا باتیں کرتے گئے۔ ان کی آوازیں اتنی اونچی ہو گئیں کہ فراٹے بھرتی گاڑیوں کا شور بھی کہیں گم ہو گیا۔

’’نہیں! میں نہیں جاؤں گی۔‘‘

’’تمہیں جانا ہی ہو گا‘‘

’’کیوں؟‘‘

’’ہم نے جو کہہ دیا۔ اتنا کافی نہیں‘‘

''نہیں''

''ایک رات ہمیں بھی دے دو''

''اونہہ! تمہاری نوکر نہیں۔ مفت میں خوش کرتی پھروں۔''

''بک بک نہ کرو۔''

''دفعہ ہو جاؤ''

''زیادہ اُچھلنے کی ضرورت نہیں۔ چپ چاپ ہمارے ساتھ چلو۔''

''نہیں جاتی۔ تم جیسے کئی دیکھے ہیں۔''

''اُٹھا کر لے جائیں گے۔''

''ہاتھ لگا کر تو دیکھو۔''

''ایسے مقدمات میں پھنساؤں گا ساری عمر جیل میں تڑپتی رہوگی۔''

''تم کچھ نہیں کر سکتے۔ تمہارے صاحب کو منتھلی دیتی ہوں۔''

''دھمکی دیتی ہے، حرام زادی!''

''اُٹھا لو اسے، ایک رات میں ساری اکڑ نکل جائے گی۔''

''پکڑو، پھینکو کار میں، کتیا!''

جب وہ دونوں لڑکی کو پکڑ کر کار میں ڈالنے لگے تو ایک منحنی سا لڑکا تماشائیوں کے درمیان سے نکلا اور ڈرتے ڈرتے لرزتی آواز میں گویا ہوا۔

''زبردستی کیوں کرتے ہو صاب کوئی اور ڈھونڈ لو۔''

ان میں سے ایک کے چہرے پر حقارت سے بھرپور مسکراہٹ پھیل گئی اور زیرِ لب بڑبڑایا جیسے کوئی گالی دی ہو۔ دوسرے نے قہقہہ لگاتے ہوئے ہولسٹر میں اڑسا پستول نکال کر لڑکے کے ماتھے پر تانا، پھر منہ سے تھوک نکال کر سڑک پر یوں پھینکا جیسے پستول سے گولی نکالی ہو۔ پستول کو چاروں اور گھماتے ہوئے واپس اسی لڑکے کے ماتھے کو تان لیا اور دھمکی دی۔

''تتر ہو جاؤ ورنہ یہیں ڈھیر کر دوں گا۔''

تماشائی تیز ہوا میں چھٹتے بادلوں کی طرح سرکنے لگے۔ دونوں نے لڑکی کو گھسیٹ کر کار میں پھینکا اور غائب ہو گئے۔

دوسرے دن ایک خبر اخباروں میں شائع اور ٹی وی چینلوں پر نشر ہوئی:

''لاہور کے پوش علاقے کی ایک کوٹھی میں دو سرکاری افسر برہنہ حالت میں مردہ پائے گئے ہیں۔ پولیس ذرائع کے مطابق اس واقعہ کے پیچھے خطرناک اشتہاری گروہ کا ہاتھ ہے۔ صوبہ کے حاکمِ اعلیٰ نے شہداء کے ورثاء کے لیے تین تین لاکھ روپے امداد اور ایک ایک وارث کے لیے ملازمت کا اعلان کیا ہے۔''

خوش رہ کر پکارتی ہے
وہ آنکھ کتنی شرارتی ہے

میں بادلوں میں گھرا جزیرہ
وہ مجھ میں ساون گزارتی ہے

ہے چاندنی سا مزاج اُس کا
سمندروں کو اُبھارتی ہے

خفا ہو مجھ سے تو اپنے اندر
وہ بارشوں کو اُتارتی ہے

کہ جیسے میں اُس کو چاہتا ہوں
کچھ ایسے خود کو سنوارتی ہے

غزل: حسن عباس
شعری مجموعہ ''ہم نے بھی محبت کی ہے''
انتخاب: آفتاب حاصل پور

شعرائے کرام سے التماس

ماہنامہ ''ارژنگ'' اگلے شمارے سے شعرائے کرام کا کلام اُن کے شہروں کے عنوان کے تحت مخصوص گوشوں میں شائع کرے گا۔ لہٰذا مختلف شہروں میں مقیم شعرائے کرام سے گزارش ہے کہ اپنا اور اپنے دوست شعراء کا کلام ہمیں جلد از جلد ارسال کریں۔ انشاء اللہ ہم آپ کا کلام مکمل اہتمام کے ساتھ شائع کریں گے۔ نیز ہم شعرائے کرام کے ایڈریس اور رابطہ نمبر بھی شائع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ لہٰذا شعراء سے التماس ہے وہ براہِ مہربانی تحریری طور پر ہمیں اجازت دیں۔ شکریہ

(مدیر ارژنگ)

(بقیہ انٹرویو یاسر پیرزادہ) **یاسر پیرزادہ:** میری پہلی تحریر ایک افسانہ تھا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں ایف ایس سی کا طالب علم تھا۔ سول سروسز اکیڈمی میں بھی میں نے بعد ازاں چند افسانے تحریر کیے۔ نوائے وقت میں "ذرا ہٹ کے" کے عنوان سے کالم نگاری بھی شروع کی مگر پھر لمبا بریک آ گیا۔ پھر 2006 میں یہ سلسلہ شروع کیا جو تا حال جاری ہے۔

ارژنگ: کہتے ہیں برگد کے نیچے برگد پرورش نہیں پا سکتا۔ آپ کو بھی اپنی الگ پہچان بنانے میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہوگا؟

یاسر پیرزادہ: جہاں عطاء الحق قاسمی کا بیٹا ہونا ایک اعزاز کی بات ہے وہاں فنی میدان میں یہ نسبت اپنی پہچان بنانے میں مشکلات کا بھی سبب بنی۔ لوگ ہو سکتا ہے سوچتے ہوں کہ اس باعث اخبار میں جگہ آسانی سے مل گئی ہوگی۔ مگر میں بتانا چاہتا ہوں کہ ایسا نہیں ہوا۔ میر شکیل الرحمٰن نے میری تحریر میرے نام کے بغیر پڑھی، اسے پسند کیا اور بعد ازاں قاسمی صاحب نے ان کو بتایا کہ یہ میرا بیٹا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ ہمارے ہاں حسد کرنے والے لوگ بھی بہت سے ہیں جن سے کسی کی کامیابی برداشت نہیں ہوتی۔ ایسے ماحول میں ابتدائی سفر دشوار تھا۔ مگر اللہ کا شکر ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ چیزیں بہتر ہوتی چلی گئیں۔

ارژنگ: آپ کی ابتدائی تحریروں میں طنز و مزاح کا پہلو خاصا نمایاں تھا۔ اب آپ کی تحریریں زیادہ سنجیدہ نظر آتی ہیں۔ طنز تو پھر بھی موجود ہے مگر مزاح کا پہلو ناپید ہوتا جا رہا ہے۔ اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟

یاسر پیرزادہ: اس کی وجہ ہمارے ملک کی صورت حال ہے۔ جب میں نے لکھنا شروع کیا تو اس وقت ملک میں دہشت گردی اتنی زیادہ نہیں تھی جتنی چند سالوں بعد برپا ہو گئی ہے۔ باقی پاکستانیوں کی طرح ظاہر ہے میں بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ دہشت گردی کے خلاف جنگ میں جتنا ہو سکا میں نے اپنا حصہ ڈالا۔ جب اس طرح تشدد کا ماحول ہو اور بے گناہ لوگ آپ کے ارد گرد مر رہے ہوں تو ایسے ماحول میں مزاح لکھنا مشکل ہی نہیں بلکہ مجھے یوں لگا کہ میں ناانصافی کروں گا معاشرے کے ساتھ اگر میں اسی طرح مزاح تحریر کروں۔ بہرحال طنز کا سلسلہ جاری ہے۔

ارژنگ: جیسے آپ نے کہا آپ کا الیکٹرانک میڈیا سے بھی تعلق ہے۔ ہمارے ہاں جو بگاڑ کی صورت حال نظر آتی ہے کیا اس میں ٹی وی ٹاک شوز کا بھی کوئی کردار ہے؟

یاسر پیرزادہ: جی ہاں ٹی وی ٹاک شوز کا بھی کردار ہے۔ ایک دلچسپ بات ہے کہ عمومی طور پر جب یہ سوال کیا جاتا ہے تو اس کا جواب یہ ہوتا ہے کہ اس کے ذمہ دار وہ لوگ ہیں جن کی صحافتی تربیت نہیں ہوئی اور وہ پیراشوٹ کے ذریعے میڈیا میں آتے ہیں۔ بظاہر یہ بات صحیح لگتی ہے مگر اتنی صحیح بھی نہیں۔ کیونکہ جتنے بھی لیڈنگ ٹاک شوز ہیں ان کی زیادہ تر تعداد کو جید صحافی ہی چلاتے ہیں اور ان میں بھی یہ سب قابل اعتراض باتیں ہوتی ہیں، جن کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے۔ جن کو پیراشوٹ کے ذریعے اس شعبے میں اترنے کا طعنہ دیا جاتا ہے۔ انہیں پیراشوٹ سے اترے بھی اب دس سال ہو گئے ہیں۔ اس لیے اب گزارش ہے کہ یہ تنقید ختم کر دیں۔

ارژنگ: شدت پسند تنظیموں پر جتنی کڑی تنقید آپ کرتے ہیں اردو صحافت میں تو ایسی کڑی تنقید شاید کوئی بھی نہیں کرتا۔ انگریزی میں بھلے ہی کرتے ہیں۔ کیا آپ کو ڈر نہیں لگتا؟

یاسر پیرزادہ: زندگی اور موت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ ویسے بھی ایک نہ ایک دن تو مرنا ہی ہے۔ زندگی میں کچھ نہ کچھ تو ایسا چھوٹا موٹا ہی سہی ضرور کر لینا چاہیے جس کے بارے میں ہم کہہ سکیں کہ ہم نے بھی اپنا حصہ ڈالا ہے۔ خطرہ تو سچ کی راہ میں بہرحال ہوتا ہی ہے۔

ارژنگ: آج کل ہمارے ہاں یہ بات بہت سننے میں آ رہی ہے کہ اینکر پرسن اور کالم نگار کو غیر جانبدار ہونا چاہیے۔ آپ کی اس بارے میں رائے کیا ہے؟

یاسر پیرزادہ: غیر جانبداری بڑا دلچسپ لفظ ہے صحافت میں۔ اگر آپ رپورٹر ہیں اور کوئی واقعہ رپورٹ کر رہے ہیں تب تو غیر جانبداری اختیار کرنے کی سمجھ آتی ہے اور یہ ضروری بھی ہے لیکن جب کالم نگار سے غیر جانبدار ہونے کا تقاضا کیا جاتا ہے تو مجھے لگتا ہے کہ اس سے مضحکہ خیز بات ہو نہیں سکتی۔ اگر تو آپ کے پسند کے لیڈر اور حکمران کی تعریف کی جائے تب تو یہ ہو گئی غیر جانبداری۔ مگر اگر اس کے خلاف بات کی جائے یا پھر کسی دوسرے کی تعریف کر دی جائے تو پھر کالم نگار صرف جانبدار ہی نہیں بلکہ بکا ہوا بھی ہے۔

آپ کالم نگار اینکر پرسن کی رائے سے اختلاف کر سکتے ہیں مگر یہ تو ممکن ہی نہیں کہ اس کی اپنی کوئی رائے نہ ہو اور وہ غیر جانبدار ہو۔ دانتے نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "دوزخ میں سب سے اندھیری جگہ ان لوگوں کے لیے مختص ہے جنہوں نے اخلاقی بحران کے دوران اپنی غیر جانبداری برقرار رکھی۔" پاکستان کے اخلاقی بحران میں اگر کوئی شخص اپنی غیر جانبداری قائم رکھتا ہے تو اس سے زیادہ بدقسمتی کی بات کوئی نہیں ہے۔

ارژنگ: آپ کا اپنا پسندیدہ کالم نگار کون ہے؟

یاسر پیرزادہ: اس سوال کا ایک جواب تو "بائی ڈیفالٹ" ہے جو کہ آپ کو معلوم ہے۔ مگر میں اس کو اس طرح دیکھتا ہوں کہ کوئی ایک فرد نہیں بلکہ ایک گلدستہ ہے کالم نگاروں کا جس میں آٹھ دس کالم نویس آتے ہیں۔ جو بھی خوبصورت لکھتے ہیں ان آٹھ، دس کالم نگاروں کے نام لینے کی ضرورت نہیں کیونکہ وہی آٹھ دس کالم نویس ہی ہیں جو اس ملک میں پڑھے جاتے ہیں۔ وہی میرے بھی پسندیدہ ہیں۔

ارژنگ: آپ نے افسانے بھی لکھے، افسانوں کا مجموعہ شائع کروانے کا ارادہ ہے؟

یاسر پیرزادہ: افسانوں کی تعداد بہت زیادہ نہیں ہے۔ اس سلسلے میں میری سستی آڑے آ جاتی ہے۔ کالم بھی میں اس لیے لکھ لیتا ہوں کہ ایک طے شدہ مقررہ مدت تک مجھے تحریر کر کے بھیجنا ہوتا ہے۔ اگر افسانے کے سلسلے میں بھی وقت کی قید کوئی شخص مقرر کر دے تو میں لکھ دوں گا۔ بصورت دیگر یہ ممکن نہیں میرے لیے۔

ارژنگ: شعر کہنے کا خیال کبھی نہیں دل میں آیا؟

یاسر پیرزادہ: شاعری کے اوزان کی مجھے سمجھ نہیں آتی۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ میری چائے کی پیالی نہیں ہے۔

ارژنگ: ٹی وی ڈراموں کے موجودہ معیار سے مطمئن ہیں؟

یاسر پیرزادہ: موجودہ ٹی وی ڈراموں میں سے بہت کم ایسے ہیں جو آپ کو مجبور کر دیں کہ آپ بیٹھ کر انہیں دیکھیں۔ اس کی اگلی قسط کا انتظار کریں۔ اگر آپ پی ٹی وی کے سنہرے دنوں کے ڈراموں جیسا ڈرامہ تلاش کریں تو ناسٹلجیا کی وجہ سے بھی ویسا ڈرامہ تو نہیں ملے گا۔ مگر آپ کو انہی میں سے کوئی خوبی تلاش کر کے آگے بڑھنا ہے۔ جیسے پچھلے دنوں ترکی کے ڈراموں نے بہت پسندیدگی حاصل کی تھی۔ اگر ڈرامے میں کوئی خوبی کا جوہر ہوگا تو پھر میرے مطمئن ہونے یا نہ ہونے سے کچھ نہ ہوگا۔ وہ خود ہی اپنی مقبولیت تلاش کر لے گا۔

نظم پر کافی کام کرنے کا موقع ملا اور کالج سے انجینئر بننے کے ساتھ ادب کی سمجھ بوجھ بھی آنے لگی۔ سرگودھا سے واپس علی پور چٹھہ آ کر بھی سلسلہ رُکا نہیں اور یہاں کی پہلی ادبی تنظیم دھنک کی اپنے دوستوں سلمان عبداللہ ڈار اور ثاقب تبسم نگینہ کے ساتھ مل کر بنیاد رکھی جو آج تک قائم ہیں۔ اس کے زیرِ اہتمام بہت سارے لازوال ادبی پروگرام اور مشاعرے کیے گئے۔ محترم اصغر سودائی نعرۂ پاکستان کے خالق نے آخری مشاعرہ جو انہوں نے سیالکوٹ سے باہر پڑھا وہ علی پور چٹھہ میں ہماری تنظیم دھنک کے زیرِ اہتمام تھا۔

ارژنگ: ادبی رسائل میں اشاعت کا آغاز کیسے ہوا؟

قمر ریاض: میں جو اردو یا پنجابی کی نظم کہتا وہ اظہر جاوید کے معروف ادبی میگزین "تخلیق" میں چھپنے کے لیے بھیج دیتا۔ اکثر نظمیں اس میں شائع ہوتیں جس کی خوشی دیدنی ہوتی اور اس طرح یہ سلسلہ آگے بڑھتا رہا۔ نظم کے ساتھ ساتھ غزل لکھنے کا سفر بھی آہستہ آہستہ جاری رہا۔ جس کی ابتدائی اصلاح اور بحر و رموز سیکھنے میں وحید احمد زمان اور میرے دوست مکرم حسین اعوان شامل رہے۔ میرے خیال میں غزل اور نظم اُردو ادب کی ایسی اصناف ہیں جن کا اپنا اپنا مزہ اور ذائقہ ہے۔ اچھی نظم خود کو شاعر سے لکھواتی ہے۔ اس کی روانی، طلسم اور رومانویت انسان کے اندر کہیں بسے ہوتے ہیں۔ بس ان کا شاعر پر یک وقت طاری ہونا ضروری ہے۔ پھر نظم خود بخود اپنا آپ منوا سکتی ہے۔ جبکہ غزل میں خیال کی مضبوطی سب سے اہم ہونے کے ساتھ ساتھ اوزان کا مکمل ہونا ہی غزل کی صوتی نغمیت کو جنم دیتا ہے۔ نظم کا اثر اپنی جگہ مگر ایک اچھا شعر زمانوں تک ساتھ رہتا ہے۔ اکثر آپ کی یادداشت سے نکل کر آپ کے ہونٹوں سے ادا ہونے لگتا ہے۔ یہی غزل کی خوبصورتی ہے کہ ہر گزرتے دن کے ساتھ ساتھ وہ مزید نکھرتی اور جدت اختیار کرتی جا رہی ہے۔

ارژنگ: آپ کی کتنی کتابیں منظرِ عام پر آ چکی ہیں اور کن اصنافِ ادب پر کام کر رہے ہیں؟

قمر ریاض: میری نظموں کا ایک مجموعہ "جیون، میں اور تتلی" کے نام سے منظرِ عام پر آ چکا ہے اور دوسرا شعری مجموعہ جس میں زیادہ غزلیں شامل ہیں، زیرِ طبع ہے۔ اصل میں بزنس اور ملازمت کی وجہ سے فرصت کم ملتی ہے۔ پھر بھی پنجابی نظموں اور ایک افسانے کے مجموعے پر بھی کام کر رہا ہوں۔ اب یہ غمِ ہائے روزگار پر منحصر ہے کہ کب مکمل کر پاتا ہوں۔

ارژنگ: اومان میں کب آئے اور یہاں کس ادبی تنظیم سے وابستہ ہیں؟

قمر ریاض: اومان میں آئے ہوئے مجھے 10 سال کا عرصہ بیت چکا ہے اور یہاں کے انڈو پاک مشاعرے اور پاکستان سوشل کلب کے زیرِ اہتمام منعقد ہونے والے مشاعرے پڑھتا آیا ہوں۔ گزشتہ ۲ سال سے میں خود پاکستان سوشل کلب کے لٹریری ونگ کا جنرل سیکرٹری ہوں جس کے زیرِ اہتمام ہم کئی ماہانہ ادبی و شعری نشستیں اور مشاعرے کروا چکے ہیں جس میں پاکستان کے نامور شعراء شرکت کر چکے ہیں۔

پاکستانی کمیونٹی کے تعاون کے باعث ہمارے مشاعرے ہر حوالے سے نہایت کامیاب اور بے مثال ہوتے ہیں۔ یہاں کے لوگ اعلیٰ ادبی ذوق کے حامل ہیں اور ایسی تقاریب میں بھرپور انداز میں شرکت کرتے ہیں۔

ارژنگ: کیا آپ کو ان تقاریب کے انعقاد میں کسی دشواری کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے؟

ان سب تقاریب میں بہت ساری دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جس میں خاص طور پر یہاں کی گورنمنٹ سے ایسی تقاریب کی منظوری سرِفہرست ہے لیکن الحمدللہ یہ سلسلہ اچھی طرح ہر حال میں ہم نے جاری رکھا ہوا ہے۔

ارژنگ: آپ کے ساتھ سوشل کلب میں اور کون لوگ ہیں؟

قمر ریاض: ہمارے ونگ میں صدر مروت احمد جو خود بہت اچھے شاعر اور مستقل میں ادبی محافل کے بانی ہیں خاص طور پر سرپرستی کر رہے ہیں۔ ان کے ساتھ ساتھ میرے اچھے دوست اور شاعر ناصر معروف شامل ہیں۔ ایک بات واضح ہو جائے کہ سوشل کلب کو یہاں اومان گورنمنٹ کی قانونی منظوری حاصل ہے۔ اس کے چیئرمین میاں محمد منیر اور نائب چیئرمین راجہ رحمت حیات ہیں۔ جو سوشل کلب کے اور تمام ونگز کے انتظامی اور قانونی انچارج ہیں۔

ارژنگ: کیا آپ اومان میں مطمئن ہیں یا اس کے علاوہ کہیں کسی اور ملک میں رہنے کا خیال تنگ کرتا ہے؟

قمر ریاض: اومان کے علاوہ کہیں اور رہنے کا خیال کبھی نہیں آیا۔ اومان اس حوالے سے انتہائی اہم ملک ہے کہ اس کی ترقی میں صاحبِ جلالہ سلطان قابوس بن سعید نے کوئی کسر نہیں چھوڑی اس لیے یہاں کی عوام خوشحال ہے اور اس ملک کے سربراہ کے لیے ہمیشہ دعا گو رہتی ہے۔ میں نے پورا گلف گھوما ہے مگر میں نے اومان سے زیادہ امن پسند ملک نہیں دیکھا۔

اقبال راہی / لاہور

سر پہ رکھ لیتا ہوں پاؤں تلے آئے ہوئے پھول
ایک تاریک سے کمرے میں بسیرا ہے مرا

میرے ہاتھوں میں اپنے ہاتھ نہ ڈال
اتنی سنگین واردات نہ ڈال
کہہ رہا ہوں جو اس کو غور سے سن
میرے منہ میں تو اپنی بات نہ ڈال
زندہ رہنے کا حق نہ مجھ سے چھین
وسوسوں میں مری حیات نہ ڈال
اک ذرا سے قصور پر پس پشت
عمر بھر کے تعلقات نہ ڈال
بھول سکتا نہیں ہے تو مجھ کو
کام مشکل ہے اس میں ہاتھ نہ ڈال
یہاں احسان مانتے نہیں لوگ
تو یہاں رسم تعلقات نہ ڈال
کیسے پھولے پھلے بہار یہاں
یہاں سرسبز ہیں نہ پات نہ ڈال

توڑ کر پھینک دو بالوں میں لگائے ہوئے پھول
کام کے رہتے نہیں کام میں لائے ہوئے پھول
میں اسی سوچ میں گم بیٹھا ہوں ساحل کے قریب
کہاں ٹھہریں گے سمندر میں بہائے ہوئے پھول
اس قدر گہرا تعلق ہے مرا خوشبو سے
سر پہ رکھ لیتا ہوں پاؤں تلے آئے ہوئے پھول
ایک تاریک سے کمرے میں بسیرا ہے مرا
کہاں رکھوں گا ترے ہاتھ کے لائے ہوئے پھول
یہ ہوا اُن سے ملاقات کا نقصان مجھے
میرے ہاتھوں سے نکلتے ہی پرائے ہوئے پھول
وہ مرے پاس سے گزرے ہیں بچا کر نظریں
اور میں رہ گیا ہاتھوں میں اُٹھائے ہوئے پھول
جب وہ یاد آتے ہیں ساون کے دنوں میں راہی
چوم لیتا ہوں میں بارش میں نہائے ہوئے پھول

آنکھوں سے اُس کی یاد کا ہالہ نہیں گیا
کانٹا یہ اپنے دل سے نکالا نہیں گیا
غم کھائے آنسوؤں کو پیا ہونٹ سی لیے
کوئی بھی حکم آپ کا ٹالا نہیں گیا
ہر چیز کائنات کی روشن ہوئی مگر
ذہن بشر سے حرص کا جالا نہیں گیا
ہر شخص کی زباں پہ ہیں اُس کی حکایتیں
ظالم سے اپنا حُسن سنبھالا نہیں گیا
دیوانگانِ حُسن کی اک بھیڑ تھی وہاں
میں اُس کی انجمن میں نرالا نہیں گیا
وہ ایک بار آئے تھے دہلیز پر مری
پھر اُس کے بعد گھر سے اُجالا نہیں گیا
آسائشوں پہ راہی میں کیا تبصرہ کروں
اس قید میں مجھے ابھی ڈالا نہیں گیا

دیکھ کر وہ مجھے حیران بھی ہو سکتا ہے
اب کے اس بات کا امکان بھی ہو سکتا ہے
اپنی من موہنی صورت پہ اُداسی نہ بکھیر
اس طرح کوئی پریشان بھی ہو سکتا ہے
نفرتیں بڑھتی رہیں گر اسی رفتار کے ساتھ
یہ حسیں شہر بیابان بھی ہو سکتا ہے
گھر کی دہلیز پہ مشعل لیے موجود ہوں میں
آنے والا کوئی انجان بھی ہو سکتا ہے
جب وہ منہ پھیر کے جاتے ہیں تو میں سوچتا ہوں
اتنا ظالم کوئی انسان بھی ہو سکتا ہے
اپنی آنکھوں سے نکلتے ہوئے آنسو روکو
ان کے پیچھے کوئی طوفان بھی ہو سکتا ہے
اپنے عارض کی گلابی مرے نزدیک نہ لا
ایسے بینائی کا نقصان بھی ہو سکتا ہے
چل پڑیں راہِ قناعت پہ اگر ہم راہی
ختم یہ حرص کا سرطان بھی ہو سکتا ہے

دلوں کے غم سے کوئی آشنا نہیں ہے کیا
بتاؤ دوستو یہ سانحہ نہیں ہے کیا
ٹھہر گئے ہو جو آ کر ہماری آنکھوں میں
اب اس سے آگے کوئی راستہ نہیں ہے کیا
دکھائی دیتے ہیں ہر سو بجھے بجھے چہرے
یہاں چراغِ محبت جلا نہیں ہے کیا
لبوں پہ مہرِ خموشی لگائے بیٹھے ہو
ہمارے ساتھ کوئی واسطہ نہیں ہے کیا
ہمارے شہر میں دُکھ بانٹنے کی ریت نہیں
یہ اختیار کسی کو ملا نہیں ہے کیا
ضمیر نام کی شے ہو رہی ہے زنگ آلود
اس آئینے میں کوئی جھانکتا نہیں ہے کیا

قیصر خالد/انڈیا

قد آوری کے لیے لوگ آج بھی سکے
کسی غریب کے دامن میں ڈال دیتے ہیں

قیصر خالد کا تعلق اس ادبی اور علمی قبیلے سے ہے کہ جس کے نزدیک علم کا سیکھنا اور سکھانا ہی مقصد حیات ہے۔ قیصر خالد نے نے بھی ابتدائی درجات سے ہی وسیع تر کسب علم کو اپنا شعار بنا لیا تھا۔ نتیجتاً درجہ اول سے ہی امتیازی کامرانی کے ساتھ حصول علم کی منازل طے ہوتے گئیں اور پھر ۱۹۹۷ء میں سول سروس کے اعلیٰ مقابلہ جاتی امتحان میں منتخب روزگار ہو کر انڈین پولیس سروس میں فائز کیے گئے۔ ایک بیدار مغز، حساس دل اور فکر انگیز ذہن رکھنے والی اس شخصیت نے اپنی زندگی کے مشاہدوں، تجربات و احساسات بیان کرنے کے لیے شاعری کو ذریعہ بنایا۔ ملازمت بھی وہ پائی جس میں انسانی افکار و احساسات، جذبات، کیفیات اور حالات کا قریب سے جائزہ لینے کا موقع فراہم ہوا۔ خود کسب تعلیم، کسب معاش اور دیگر وقتی ضروریات کے تحت ہجرت و بے وطنی اور اقدار کی کشمکش جیسے مشاہدات سے دوچار ہوئے اور ان ہی حالات کے باعث زندگی کے تنوع کے بھرپور جائزے کا موقع ملا۔ شادی بھی ایک ایسے خانوادے میں ہوئی کہ جو کتب عظیم آباد کے بانیان میں سے تھے۔ ان کی اہلیہ مشہور شاعر جناب سید محمد علی شاد عظیم آبادی کی پڑپوتی ہیں۔ خسر مرحوم پروفیسر آل احمد انجم فاطمی جو کہ بذات خود کئی کتابوں کے مصنف بھی تھے، کے ساتھ لمبے عرصے تک رہنے کا موقع نصیب ہوا۔ جن کی رہنمائی میں ادبی ذوق اور شاعری کے شعور کو مزید جلا ملی۔ پہلے تالیف کا کام کیا، دیوان شاد عظیم آبادی کو مرتب کر کے شائع کروایا۔ پھر یہ سلسلہ آگے چلتا گیا اور اب ان کا خود کا مجموعہ کلام آپ کی نذر ہے۔ فی الوقت وہ ایڈیشنل کمشنر آف پولیس کے عہدے پر شہر ممبئی میں اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ (اطہر شکیل نگینوی)

کچھ ہم کو اس طرح چھوڑا وفا نے
جوں اہل حق کو اہل کربلا نے
نظر کو آ گیا چہرے بھی پڑھنا
کیا احسان یہ ان کی جفا نے
رہے ناکام ساری عمر، پھر بھی
کہاں اُمید چھوڑی ہے دُعا نے
ہوا عرصہ، جو کانوں میں گھلی تھی
رکھا مسحور اس آواز پا نے
یہ شعبہ عزت و ذلت کا ناداں!
لگے ہے تجھ کو سونپا ہے خدا نے؟
ہو جیسا بھی نظریہ، کم نہیں یہ
کیا محتاط کچھ خوف سزا نے
بدل کا نظم رکھا ربط باہم
وفا سے رشتہ اُمید جزا نے
کہاں ابر کرم سوکھا پڑا تھا
کہاں پانی کو برسایا گھٹا نے
بنے معصوم بچے ڈھال، میرے
بڑھایا ہاتھ جب جب بھی قضا نے
جو تھی سنجیونی مہلک بھی ٹھہری
بنایا اور مٹایا بھی وفا نے
جو محسن تھے وہی قاتل بھی ٹھہرے
دکھایا یہ تماشہ بھی قضا نے

کیا عہد نو میں اپنی پہچان دیکھتا ہوں
اکثر بہ شکل انساں حیوان دیکھتا ہوں
خوابوں کو، جستجو کو، رکھنا ابھی سفر میں
کچھ دور چل کے راہیں آسان دیکھتا ہوں
رفتار وقت تو نے پائی ہے کیسی عجلت
جذبوں میں عصر نو کے ہیجان دیکھتا ہوں
آئی ہے خاک ہستی اُٹھ کر کہاں سے اپنی
خوابوں میں کچھ جزیرے انجان دیکھتا ہوں
امن و اماں کی باتیں، شاید ہیں صرف باتیں
ارض خدا پہ ہر دن گھمسان دیکھتا ہوں
جب جستجو نہ منزل اور خواب ہیں نہ ارماں
پھر کس لیے سفر کا سامان دیکھتا ہوں
تبدیل ہو گئی ہیں اقدار کہنہ، یوں بھی
یہ کائنات ساری حیران دیکھتا ہوں
میری نگاہ آخر حساس کیوں ہے اتنی
میں روز و شب بدلتے انسان دیکھتا ہوں
دیتی ہے جب بھی فرصت کچھ گردش زمانہ
رشتوں میں اپنی باقی پہچان دیکھتا ہوں
گزرے تھے جس میں لمحے بچپن کے قہقہوں میں
خوابوں میں وہ حویلی ویران دیکھتا ہوں

وہ خواب ایسے بھی آنکھوں میں ڈال دیتے ہیں
خیال خام کو دل سے نکال دیتے ہیں
قد آوری کے لیے لوگ آج بھی سکے
کسی غریب کے دامن میں ڈال دیتے ہیں
یہی ہے شوق رعونت انہیں، کسی کی بھی
ذرا سی دیر میں پگڑی اُچھال دیتے ہیں
بڑی خبر بھی کبھی تو بڑی نہیں رہتی
کبھی ذرا سی خبر کو اُچھال دیتے ہیں
یہ خود پسندوں کو کیا شوق خود نمائی ہے
جو بات بات میں اپنی مثال دیتے ہیں
مجال کس کی کرے کوئی یہ سوال ان سے
وہ کس کو ہجر، تو کس کو وصال دیتے ہیں
پرکھتے ہیں وہ ذہانت کو یوں سر محفل
جواب جس کا نہ ہو، وہ سوال دیتے ہیں

اعظم کمال/

لہو پسند ہے جن کو وہ راج مانگتے ہیں عجیب لوگ ہیں سب تخت و تاج مانگتے ہیں

میجر اعظم کمال کا تعلق کمالیہ (ٹوبہ ٹیک سنگھ) سے ہے۔ سابق آرمی آفیسر، سابق پرنسپل فوجی فاؤنڈیشن کالج گجرات اور ایڈمنسٹریشن ہکن ہاؤس نیولینڈ لاہور کے علاوہ کمال پبلشرز کے چیف ایگزیکٹو بھی ہیں۔ "ساحل کی بھیگی ریت"، "غزل تو"، "لوحِ عروض" اور "اشک مسکراتے" کے نام سے ان کی تصانیف شائع ہو چکی ہیں۔ اُن کی شاعری ادبی اور عوامی حلقوں میں کافی پسند کی جاتی ہے۔ (ادارہ)

رشک صد آسماں نہیں ہوتا
دھوپ کا سائباں نہیں ہوتا
میرا مسلک نہیں ہے نانِ جویں
سو مرا امتحاں نہیں ہوتا
یہ جو ہنگامۂ شبِ غم ہے
میں جہاں ہوں وہاں نہیں ہوتا
چھاؤں میں ہے مرے بزرگوں کی
میرا بچہ جواں نہیں ہوتا
زندگی زندگی اسی سے ہے
رونا دھونا کہاں نہیں ہوتا
گفتگو جس جگہ ضمیر کی ہو
میں وہاں بے زباں نہیں ہوتا
کیا کہوں دوستوں کے بارے میں
مجھ سے اعظم بیاں نہیں ہوتا

بس ایک بار ملی بوئے وصلِ یار مجھے
پھر اُس کے بعد رہا خود پہ نہ اختیار مجھے
اِدھر اُدھر کے حوالوں سے جی اُلجھتا ہے
جو ہو سکے تو مرے نام سے پکار مجھے
میں اپنے آپ کو بھولا ہوا ہوں برسوں سے
بلا رہا ہے کوئی پھر بھی بار بار مجھے
بکھر نہ جاؤں کہیں مجھ کو خوف رہتا ہے
فصیلِ خواب کی اُونچائی سے اُتار مجھے
یہ آرزو ہے کبھی سوئے رفتگاں دیکھوں
کوئی ملے گا نہیں، ہے یہ اعتبار مجھے
یہ کیا مقام ہے آخر کہاں پہ چھوڑ گیا
گرفت کر کے تیری یاد کا غبار مجھے
دیارِ رنگِ تمنا کا گیت کیوں اعظم
سنا رہا ہے گریباں کا تار تار مجھے

لہو پسند ہے جن کو وہ راج مانگتے ہیں
عجیب لوگ ہیں سب تخت و تاج مانگتے ہیں
امیرِ شہر مبارک ہو تم کو مال و منال
غریب لوگ ہیں ہم کام کاج مانگتے ہیں
ہمارے دیس کی قسمت سنوارنے والے
پرائے دیس کے رسم و رواج مانگتے ہیں
ستم کی بات تو یہ ہے سمندروں کے بھنور
ستم بدوش ندی سے خراج مانگتے ہیں
لہو بہانے کی رسموں سے کچھ نہیں ہوگا
یہ شہر والے نیا احتجاج مانگتے ہیں
بہشت چھوڑ کے آئے ہوئے زمانہ ہوا
زمین والے ابھی تک اناج مانگتے ہیں
یہ سر رہے نہ رہے اس کا غم نہیں اعظم
جو تاج ہم سے چھنا ہے وہ تاج مانگتے ہیں

اسے پسند اُسے ناپسند کرتے رہے
ہم اپنے آپ کو لفظوں میں بند کرتے رہے
ستارہ توڑ کے لانے کی آرزو تھی بہت
کبھی کبھار نظر کو کمند کرتے رہے
مقامِ صبر نہیں تھا مگر بہوش و حواس
ہم اپنے لہجے کی تلخی کو قند کرتے رہے
قدم قدم پہ نئی کھائیوں کے ہوتے ہوئے
تصورات کے آہو زقند کرتے رہے
لیا نہ درس کسی مدرسے سے نفرت کا
ہم اپنے دل کو سدا دردمند کرتے رہے
کمال ہے کہ بھلا کر تمام ناموں کو
بس ایک نام کا پرچم بلند کرتے رہے
ہمارے جیسا کوئی بھی تہی نہیں اعظم
حریفِ جاں کو سدا ارجمند کرتے رہے

زادِ سفر کو ساتھ رکھا ہے سفر میں ہوں
میں رہ گزر سے دور نہیں رہ گزر میں ہوں
یہ جنگ ختم ہوگی نہیں چاہے کچھ بھی ہو
میں گھر کے طاق پر بھی ہوا کی نظر میں ہوں
شانوں کے ساتھ ہے میرا سبزہ لگا ہوا
سایا ہوں اس لیے تو ابھی تک شجر میں ہوں
مدت ہوئی ہے گھر سے میں باہر نہیں گیا
آواز دے کے دیکھ لے تو مجھ کو گھر میں ہوں
میں ہوں سحر گزیدہ مگر ایک عمر سے
در در بھٹک رہا ہوں تلاشِ سحر میں ہوں
خانہ بدوشیوں نے کہیں کا نہیں رکھا
جنگل میں ہوں نہ شہر، نہ بستی، نہ گھر میں ہوں
سکہ مرا چلے گا مجھے یہ یقین ہے
اعظم ہنوز کاسۂ دریوزہ گر میں ہوں

راجہ صفدر حسین صفدر / جوہر آباد

سرد جھونکوں سے ہے یوں جھومتی ڈالی ڈالی
جیسے دوشیزہ کوئی حُسن پہ اترائی ہے

گوری گھونگھٹ کھول رہی ہے
نینوں سے کچھ بول رہی ہے
کیسی مدھر آواز ہے اس کی
کانوں میں رس گھول رہی ہے
پھولوں کے انبار لگے ہیں
مالن موتی رول رہی ہے
دیکھ کر چنچلی اس کی
جیون نیا ڈول رہی ہے
گھور اندھیرا، بادل چھائے
کون یہ زلفیں کھول رہی ہے
کس کو ذہن کروں یہ اُلفت
سب کی نظریں تول رہی ہے
کیا اُتری ہے شام سہانی
جام سے مینا بول رہی ہے
کمسن ہوگی، ناداں ہوگی
جھینپ رہی ہے ڈول رہی ہے
صفدر نے جو شعر کہے ہیں
روح عدم کی بول رہی ہے

حسینوں کی گلی آنے لگی ہے
عجب اک بے کلی چھانے لگی ہے
ذرا اس چشم کے تیور تو دیکھو
کہ جیسے عشق فرمانے لگی ہے
جسے ہم نے سکھائی رمزِ اُلفت
وہی اب ہم کو سمجھانے لگی ہے
ہمارے ساتھ اُٹھتی بیٹھتی تھی
مگر اب یونہی شرمانے لگی ہے
ہوا میں زلف کی خوشبو رچی ہے
ہمیں کچھ نیند سی آنے لگی ہے
کبھی مائل، کبھی برہم نگاہیں
کبھی احساس پر چھانے لگی ہے
حسینوں کا کوئی میلہ لگا ہے
کہ ہر نوخیز اترانے لگی ہے
بہت مرتا ہے تم پر جان و دل سے
سکھی اس کو سمجھانے لگی ہے
یہ کیسا کیف سا چھایا ہے صفدر
غزل پر اب غزل آنے لگی ہے

ناسزا آپ نے تکلیف یہ فرمائی ہے
آنکھ مدہوش ہے بہکی ہوئی انگڑائی ہے
سرد جھونکوں سے ہے یوں جھومتی ڈالی ڈالی
جیسے دوشیزہ کوئی حُسن پہ اترائی ہے
برسیں ساون کی پھواریں ہوا مسرور بدن
یاد اس شوخ کی پھر ذہنوں میں در آئی ہے
کیسے جلووں نے ترے ہم کو کیا تھا مسحور
پھر سے سوچوں میں کوئی برق سی لہرائی ہے
میں تو بیٹھا تھا اکیلا غمِ ہجراں سے ملول
جانے کس وقت وہ چپ چاپ چلی آئی ہے
آئینہ دیکھ کے خود اپنے ہی دیدار میں مست
پھر مجھے دیکھ کے کیا جھینپی ہے شرمائی ہے

کون کہتا ہے یہ ہیں ماضی کے قصے صفدر
ان حسینوں سے ابھی اپنی شناسائی ہے

حُسن یوں جلوہ سرا ہو جیسے
پھول ٹہنی پہ کھلا ہو جیسے
کونپلیں عشق کی پھر پھوٹتی ہیں
پودا ساون میں ہرا ہو جیسے
گیت برہا کے سنائے بلبل
دل مرا ڈوب گیا ہو جیسے
کان آہٹ پہ لگے رہتے ہیں
کوئی دروازہ کُھلا ہو جیسے
سرسراہٹ سی ہے سرگوشی سی
کوئی پیغام دیا ہو جیسے
پھر مجھے پیار سے دی ہے آواز
مجھ کو ایسے ہی لگا ہو جیسے
راستہ ایک ہی تھا گھر کو مرے
پھر بھی وہ بھول گیا ہو جیسے
آج صفدر نے سنائی وہ غزل
ہر کوئی جھوم گیا ہو جیسے

چاند تاروں کے پاس رہنے دے
ماہ پاروں کے پاس رہنے دے
حُسن بھرتا ہے جس جگہ پانی
ان کناروں کے پاس رہنے دے
رُت بدلتی ہے جن کے جلووں سے
ان بہاروں کے پاس رہنے دے

حکیم سلیم اختر / لاہور

وہ اپنے حال میں ہر وقت مست رہتے ہیں — فقیر جھوٹی انا کی طلب نہیں رکھتے

جو بے وفا ہیں وفا کی طلب نہیں رکھتے
اندھیری شب میں ضیاء کی طلب نہیں رکھتے
مسافروں کو جو رکھتے ہیں دور منزل سے
ہم ایسے راہ نما کی طلب نہیں رکھتے
کہاں پہ لائی ہے بے رہروی کی تاریکی
خدا کے بندے خدا کی طلب نہیں رکھتے
کچھ ایسی حبس کی عادت سی پڑ گئی ہے ہمیں
ہم ایسے لوگ ہوا کی طلب نہیں رکھتے
خزاں کے سائے میں ہوتی ہے پرورش جن کی
وہ پھول بادِ صبا کی طلب نہیں رکھتے
وہ اپنے حال میں ہر وقت مست رہتے ہیں
فقیر جھوٹی انا کی طلب نہیں رکھتے
فنا کے گھاٹ اُترتے ہیں جو خوشی کے ساتھ
کسی طرح وہ بقا کی طلب نہیں رکھتے
ہمارا کام اندھیروں میں روشنی کرنا
ہم اس کے بدلے جزا کی طلب نہیں رکھتے
بجھے پڑے ہیں دلوں کے چراغ برسوں سے
کسی سہانی فضا کی طلب نہیں رکھتے
دعا کے ساتھ بندھی جن کی ڈور ہو اختر
کبھی وہ لوگ دوا کی طلب نہی رکھتے

یہ کیا ہوا ہم ان کی نظر سے اُتر گئے
آنکھوں نے جتنے خواب بنے تھے بکھر گئے
اس واسطے گزرتے نہیں راہِ عشق سے
اس راستے میں کتنے جوانوں کے سر گئے
جن کا بسیرا تھا کبھی پھولوں کے دیس میں
پرخار وادیوں میں خوشی سے اتر گئے
ٹھہرے نہ ایک پل بھی تری دید کے لیے
ہم بے خودی میں تیری گلی سے گزر گئے
بدنام ہو نہ جائیں کہیں تو اسی لیے
ہم تیری انجمن میں جھکا کر نظر گئے
محفل میں تیرے چاہنے والے تھے بے شمار
جانا نہ چاہتے تھے وہاں ہم مگر گئے
اب بھول کر بھی یاد وہ آتے نہیں مجھے
اختر وہ دل لگی کے زمانے گزر گئے

آدمیت کا جہاں معیار ممکن ہی نہیں
ایسے میں محفوظ ہو دستار ممکن ہی نہیں
زندگی کے بھی ہوا کرتے ہیں کچھ زریں اصول
نفرتوں کے دائرے میں پیار ممکن ہی نہیں
پانیوں کے جو بہاؤ پر نہیں رکھتا نظر
وہ پہنچ جائے سمندر پار ممکن ہی نہیں
اُٹھ چکے ہیں ایک ایسی راہ پر میرے قدم
ساتھ چل پائیں مرے غم خوار ممکن ہی نہیں
شوقِ منزل میں رواں ہوں تیز لہروں کی طرح
روک لے مجھ کو کوئی دیوار ممکن ہی نہیں
آپ نے تجویز دی ترکِ تعلق کی ہمیں
یہ ہمارے واسطے سرکار ممکن ہی نہیں
جس جگہ اختر ہو دستور زباں بندی وہاں
انقلابی سوچ کا پرچار ممکن ہی نہیں

نہ جانے کیوں خیال آتا ہے مجھ کو
جدائی کی گھڑی نزدیک تر ہے
ترے وعدوں پہ مرتا تھا کبھی میں
مگر اب سوچ اُجلی ہو گئی ہے
ترا پیکر بھی اب بھاتا نہیں ہے
یہ پرچم دل پہ لہراتا نہیں ہے
میں اب دل کے کہے پر چل پڑا ہوں
تری تصویر آنکھوں سے ہٹا کر
میں دریا کے کنارے پر کھڑا ہوں
بہا لے جائے یہ طوفان مجھ کو
گنوانی ہے کبھی تو جان مجھ کو
تری آنکھیں نہ اب روکیں گی مجھ کو
میں اپنے آپ سے گھبرا گیا ہوں
جدائی کے تھپیڑے سہتے سہتے
میں اس جیون سے بھی اُکتا گیا ہوں
تجھے کیا تو ہے اپنے حال میں مست
یہاں چھلنی ہوا میرا جگر ہے

تصویرِ بے بسی ہوں مجھے ہاتھ مت لگا
دم توڑتی خوشی ہوں مجھے ہاتھ مت لگا
پامال کر نہ اپنے ارادوں کے زاویے
بے نور روشنی ہوں مجھے ہاتھ مت لگا

رائے عابد علی/شیخوپورہ

تیرے بچوں کو بھی دریا نہ بہا کر لے جائے
ان کے ذہنوں میں تو سیلاب کا ڈر رہنے دے

صحن سے باہر جو جھانکا تو لگا ڈر اور بھی
اب سزا کے طور پہ برسیں گے پتھر اور بھی
خواہشوں کے خون سے لت پت ہوا ہے پیرہن
کیا ابھی چلنے ہیں ناکامی کے خنجر اور بھی
گھن مسلسل کھا رہا تھا نفرتوں کا جسم کو
کھوکھلا پھر کیوں نہ ہوتا میرا پیکر اور بھی
مجھ سے اُنگلی مت چھڑاؤ راستے تاریک ہیں
اس جدائی کے گھنے جنگل میں ہیں ڈر اور بھی
تیری چوکھٹ چھوڑ کر جینا بہت مہنگا پڑا
دربدر ہوتا گیا میرا مقدر اور بھی
مال و زر کے شور نے ماحول بہرہ کر دیا
اب تو عہدِ نو میں اُتریں گے یہ پتھر اور بھی
اپنے اندر خواہشوں کی بارہا ترمیم کی
پھر بگڑتے کیوں گئے قسمت کے تیور اور بھی
جب سے میرا عشق تیرے حُسن کی بیعت ہوا
تیرے خال و خد مجھے لگتے ہیں سُندر اور بھی
مجھ کو کوئی جان سکتا ہی نہیں میرے سوا
ہیں میرے اندر مقفل کچھ مرے در اور بھی
جب کبھی للکارتی ہیں کچھ یزیدی سازشیں
یاد آتے ہیں مجھے عابد بہتر اور بھی

سارا الزام ہی مت شہر کے سر رہنے دے
واپس آنا ہے تو پھر گاؤں میں گھر رہنے دے
آنکھ کا سارا سمندر میرا دشمن ٹھہرا
مجھے ساحل نہ طلاطم نہ بھنور رہنے دے
وہ مجھے آخری صف میں بھی بٹھا سکتا ہے
کب وہ چاہے گا کہ اونچا مرا سر رہنے دے
ہر مسافر سے تھکاوٹ نہیں ہوتی برداشت
چند اشجار سرِ راہ گزر رہنے دے
میری تخلیق کو پہچان عطا کر مولا
یا مجھے تشنۂ تکمیل ہنر رہنے دے
یہ نہ ہو پھر کبھی دربار میں جانا پڑ جائے
ابھی دستار میں سرخاب کا پر رہنے دے
تیرے بچوں کو بھی دریا نہ بہا کر لے جائے
ان کے ذہنوں میں تو سیلاب کا ڈر رہنے دے
اتنے آنسو نہ بہا ہجر میں اُس کے عابد
ڈوب جائے گا سمندر کا سفر رہنے دے

تمہاری یاد نے چھیڑے ہیں تار فرقت کے
بجے ہیں اشکوں سے ڈھل کر نگار فرقت کے
جگر کا خون اندھیروں کی چار دیواری
بہت حسین تقاضے ہیں یار فرقت کے
کبھی جو وصل کی دولت مرے بھی ہاتھ آئے
اُتار دوں گا یہ سارے اُدھار فرقت کے
اُسے یقین دلانا بلا کی ظلمت میں
منائے جشن ہیں، میں نے ہزار فرقت کے
ہوائے کوچہ جاناں نے صحن میں عابد
کھلائے پھول مگر بار بار فرقت کے

مری قسمت کی تختی پر کچھ ایسے لکھ گیا آنسو
نظر آئے ہیں ہر جانب مجھے میرے خدا آنسو
ترے اندر کا یہ صحرا کبھی سیراب نہ ہوگا
اگر آنکھیں بچاتی ہیں روانی سے بہا آنسو
مرے سب داغ عصیاں دُھل گئے شبیرؑ کے صدقے
میرے دامن پہ جب ٹپکا بنامِ کربلا آنسو
جو میں نے زندگی بھر کی ریاضت کا صلہ مانگا
مری خالی ہتھیلی پر کسی نے رکھ دیا آنسو
غمِ سیلابِ فردا سے ہمیں آگاہ کرتے ہیں
وگرنہ آئے آنکھوں میں کبھی نہ بے وجہ آنسو
یقیناً بھول جاتا وہ مری ہر ایک لغزش کو
اگر اک بار آ کر دیکھ لیتا بے بہا آنسو
گلابوں نے بھی اپنی بے گناہی کے لیے عابدؔ
کبھی شبنم کبھی بارش سے پتوں پر لکھا آنسو

کیا عطا ہونے کو ہے خوشبو کی سلطانی مجھے
لوریاں دیتی ہے اکثر رات کی رانی مجھے
خیر جتنی بھی ملی تھی گھر تلک پہنچی نہیں
مار ڈالے گی یہ اپنی چاک دامانی مجھے
جھوٹ کا کاگا بولتا تھا سارا دن ہی بام پر
میں یہ سمجھا تھا ملے گی تیری مہمانی مجھے
پیاس جب بھی یاد آتی ہے علی اصغرؑ تیری
زہر لگتا ہے کبھی دریاؤں کا پانی مجھے
ہوک پھر اُٹھتی ہے عابدؔ دل کے سونے گاؤں سے
جب بھی آوازیں دیا کرتی ہے ویرانی مجھے

زاہد محمود شمس/لاہور

پروین شاکر کی یاد میں طویل نظم سے......

پھول قرطاس پہ وہ سجاتی رہی
وہ تو لفظوں سے منظر بناتی رہی
آئینہ نفرتوں کو دکھاتی رہی
سب کو انداز الفت سکھاتی رہی
بن کے مینا کہیں گنگناتی رہی
بن کے تتلی کہیں لہلہاتی رہی
اپنی ہمت کو وہ آزماتی رہی
دل کے شیشے کے ٹکڑے ملاتی رہی
دکھ کے دامن سے کانٹے چھڑاتی رہی
سکھ کی زنجیر برسوں ہلاتی رہی
وقت کی رو میں خود کو بہاتی رہی
پھول ہر سمت لیکن لٹاتی رہی
سب اناؤں کے مندر گراتی رہی
جانے والوں کو خود ہی بلاتی رہی
جس قدر اپنے دکھ کو دباتی رہی
اُس قدر دکھ میں وہ ٹمٹماتی رہی
تھے خزانے جہاں کے بہت سامنے
ہاتھ پھولوں کی جانب بڑھاتی رہی
پیار کی راہبر پیار کے نام پہ
دم بہ دم اپنے سر کو جھکاتی رہی
سبز چشموں سے سیراب کر کے سخن
امن اور پیار کے پھول اُگاتی رہی
بن کے ہر دم بہاروں کی نورِ نظر
دھوم پت جھڑ میں بھی وہ مچاتی رہی
ساحرانہ لب و لہجہ اپنا کے وہ
دل میں رہنے کا اعزاز پاتی رہی
جیسے پھولوں کی ہو شاہزادی کوئی
پنکھڑی سے وہ خوشبو اُڑاتی رہی
راہِ اُلفت کو منزل سمجھتی تھی وہ
راہِ اُلفت میں پلکیں بچھاتی رہی
اُس سے زیادہ لبوں پہ سجائی ہنسی
دل پہ جتنے بھی وہ زخم کھاتی رہی
لعل و گوہر سے ارزاں ہے انسان کا دل
قدر دل کی ہمیشہ بڑھاتی رہی
اپنی معصومیت کے وہ پاکیزہ رنگ
ہر نگارش پہ دل سے چڑھاتی رہی

درسِ انسانیت کر کے روشن سدا
یاد پیغمبروں کی دلاتی رہی
اپنے ہاتھوں سے خود پونچھ کر اپنے اشک
اپنے سینے سے خود کو لگاتی رہی
تتلیوں، چاند تاروں سے بہلا کے من
اپنی تنہائیوں کو مناتی رہی
عمر بھر روز و شب کو بکو، دم بہ دم
راہِ اُلفت میں پلکیں بچھاتی رہی
کب وہ اپنے لیے وہ تو سب کے لیے
سب کی محفل میں ہر حال جاتی رہی
ایسا لگتا ہے اُس کو مہکتے حروف
خوشبو ہاتھوں سے چن کر تھماتی رہی
بن کے چڑیا ادب کے حسیں باغ میں
وہ تو چاروں طرف چہچہاتی رہی
لفظ ہی خاص یاور تھے اُس کے یہاں
سنگ لفظوں کے جیون بتاتی رہی
رنج و غم کے بھنور رہ میں آئے بہت
ہر قدم پہ قدم وہ جماتی رہی
وقت کی روح فرسا کڑی دھوپ میں
خود کو لفظوں کو تھامے بھگاتی رہی
پیکرِ عزم و ہمت تھی وہ صاحبو
کیسے کہہ دوں کہ وہ لڑکھڑاتی رہی
اُس کے الفاظ کے طائروں کی اُڑان
اُس کے دکھ سکھ ہمیں بھی سناتی رہی
دامنِ صبر سے اشک سب پونچھ کر
خود کو لوری سنا کے سلاتی رہی
اپنے ہر درد کا بوجھ اُٹھاتے ہوئے
اپنے شانوں کو خود تھپتھپاتی رہی
اوج یہ ہی تو ہے اُس کے افکار کی
پتھروں کے دلوں کو گھلاتی رہی
لب جو کھلتے تو ہر سو بکھرتی مہک
لفظ دل کے چمن سے وہ لاتی رہی
جس نے دیکھا ہے اس کو وہ شاہد بھی ہے
آندھیوں میں دیے وہ جلاتی رہی

بس محبت، محبت، محبت تھی وہ
لفظ نفرت بھی ہم کو بھلاتی رہی
جتنے راہوں میں کوہِ ستم آئے تھے
اپنے لفظوں سے اُن کو ہٹاتی رہی
جو ہر اک موڑ پہ مجھ کو نازاں کرے
یہ محبت ہے سب کو بتاتی رہی
ساتھ جب تک تھا ممکن حبیبوں کا وہ
سانس کی ڈور تھامے نبھاتی رہی
غم کی ہر بیں پہ اُس نے مسکا دیا
غم کو خوشیوں کے پیچھے چھپاتی رہی
کر کے شمشیر اپنا قلم ہر گھڑی
ظلم کے سامنے سر اُٹھاتی رہی
آس آنکھوں میں ساحل کی مرنے نہ دی
ٹوٹے دل سے بھی کشتی چلاتی رہی
تم کو پروین کتنوں نے دیکھا نہیں
پھر بھی تم ان کے دل میں سماتی رہی
دل ترا تذکرہ چھیڑ بیٹھا تو تھا
دیر تک یاد تیری رُلاتی رہی
میں ترے جو تصور میں کھلتا رہا
سوچ میری مہک میں نہاتی رہی
تیرے لفظوں سے اُٹھتی مہک دیکھ کر
دور نفرت کھڑی کپکپاتی رہی
تیرے جانے کی ظالم خبر دیر تک
ذہن و دل میں کھڑی سنسناتی رہی
روک پائی نہ تتلی تجھے جانے سے
پاس آ کر ترے پھڑپھڑاتی رہی
تیری خوشبو حزیں ہے ترے بعد اب
تیرے ہوتے ہوئے دندناتی رہی
لفظ پروین تیرے سبھی ہیں امر
ان کو خونِ جگر تو پلاتی رہی
تجھ پہ نازاں ہے یہ آسمانِ ادب
تو جہاں مثلِ مہ جگمگاتی رہی
میں اُسے دیکھ کر شمس کھلتا رہا
وہ مرے سامنے جھلملاتی رہی

عاشق حسین/سکردو

میں وہ بے کار مصور ہوں جوفن پاروں کو
گھر کی الماری میں رکھتا ہوں گنوا دیتا ہوں

میں اپنی عرض اشکوں کی زبانی لے کے آیا ہوں
ترے قدموں میں رکھنے کو جوانی لے کے آیا ہوں
جسے سُن کر کوئی ہنس دے، کوئی روئے، کوئی چپ ہو
سرِ محفل میں ایک ایسی کہانی لے کے آیا ہوں
کہا اُس نے محبت سے کسی کی جان لینی ہے
کہا میں نے، میں اپنی زندگانی لے کے آیا ہوں
مجھے پہچاننے میں اب کوئی مشکل نہیں ہوگی
میں اپنے ساتھ ماضی کی نشانی لے کے آیا ہوں
نکالا اس نے جنت سے تو "میں" ایسے نہیں نکلا
زمین و آسماں کی حکمرانی لے کے آیا ہوں
مرا ہر لفظ میری زندگانی ہی تو ہے عاشق
میں دنیا میں حیاتِ جاودانی لے کے آیا ہوں

آنکھ میں بساتے ہیں دل سے دور کرتے ہیں
لوگ بے وفائی کی حد عبور کرتے ہیں
معذرت تو کرتے ہیں اپنی سب خطاؤں کی
اس کے بعد دانستہ ہم قصور کرتے ہیں
ہم بھی ابنِ آدم ہیں یہ ہماری فطرت ہے
جو ہمیں نہ کرنا ہو وہ ضرور کرتے ہیں
سر بلند ہوتے ہیں ان کے نوکِ نیزہ پر
لوگ جو زمانے کو باشعور کرتے ہیں
اپنا فائدہ ہو تو دین بیچ دیتے ہیں
پھر بھی ہم مسلمانی پر غرور کرتے ہیں
اس کا عکس اُبھرتا ہے جلوہ گاہِ ہستی میں
دل کو اپنے جب عاشق کوہِ طور کرتے ہیں

وہ آنکھ کیا جسے جلوے کا انتظار نہ ہو
وہ دل ہی کیا جسے حسنِ جہاں سے پیار نہ ہو
میں ایسے حال میں دم گھٹ کے مر نہ جاؤں گا؟
مرے قلم پہ اگر میرا اختیار نہ ہو
زبان کاٹ کے کہتا ہے بولنے کیلئے
قرار چھین کے کہتا ہے بے قرار نہ ہو
مرے وجود سے خود مجھ کو خوف آتا ہے
تری تلاش مرے سر پہ جب سوار نہ ہو
میں جان بوجھ کے خطروں سے کھیل جاتا ہوں
وہ کھیل کھیل نہیں جس میں جیت ہار نہ ہو
دلِ شکستہ سے آتی ہے یہ صدا عاشق
خدا کرے کہ محبت کبھی اُدھار نہ ہو

جس پہ بڑے خلوص سے احسان کر دیا
پہلے اُسی نے جنگ کا اعلان کر دیا
"حق" جس نے بھی کہا اسے سولی چڑھا دیا
یا پھر اُسے حوالۂ زندان کر دیا
دیکھا جو حُسنِ یار کلی ہنس کے کھل اٹھی
پھولوں نے اپنا چاک گریبان کر دیا
حیرت سے آسمان کی آنکھیں نکل گئیں
جب میں نے خود کو اس پہ بلیدان کر دیا
سانسوں پہ میری اپنی حکومت نہیں ہے کیوں
عاشق کو اس سوال نے حیران کر دیا

دل کو احساس کی سولی پہ چڑھا دیتا ہوں
خود کو یوں جرمِ محبت کی سزا دیتا ہوں

میں وہ بے کار مصور ہوں جوفن پاروں کو
گھر کی الماری میں رکھتا ہوں گنوا دیتا ہوں
آگ سینے میں لگاتے ہیں زمانے والے
سانس لیتا ہوں اُسے اور ہوا دیتا ہوں
اپنے دُکھ کو کبھی دُکھ ہی نہیں سمجھا میں نے
اُن کے دُکھ پر تو میں طوفان اٹھا دیتا ہوں
اِس قدر خوف ہے عاشق مجھے تاریکی سے
روشنی کے لئے گھر بار جلا دیتا ہوں

بدلتا رہ گیا ہر بار موسم، تم نہیں آئے
مجھے کھاتا رہا ہے بس یہی غم، تم نہیں آئے
نہیں ہونے دیا میں نے ہوا کی سازشوں میں بھی
محبت کا دیا اک آن مدھم، تم نہیں آئے
پیالہ زہر کا پینے سے مجھ کو، کون روکے گا
رکھے گا کون زخمِ دل پہ مرہم، تم نہیں آئے
بلاآخر توڑ ڈالا ضبط کا "بند" بے قراری نے
نگاہیں ہوگئیں پھر میری پُرنم، تم نہیں آئے
اب آئے ہو کہ جب بے جان پیکر ہوگیا میرا
تھے جب تک میرے ہاتھوں میں بھی دم خم، تم نہیں آئے
یہ کیا کم ہے کہ سارے شہر میں اک تیرے عاشق نے
نہیں جھکنے دیا چاہت کا پرچم، تم نہیں آئے

سکردو میں مقیم معروف شاعر عاشق حسین عاشق کا
پہلا شعری مجموعہ
گمشدہ خواب
مکمل اہتمام کے ساتھ شائع ہوگیا ہے
ناشر: نستعلیق مطبوعات
الفیروز سنٹر غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور

میاں محمد مرغوب / ساہیوال

کوئی حکمت یہاں صورت گرِ تقدیرِ عالم ہے　　کوئی مقصد پسِ سود و زیاں معلوم ہوتا ہے

جناب محمد میاں مرغوب کی غزل قاری کے لیے ایک خوش کن تجربہ ان معنوں میں ہے کہ اس میں انبساط و غم کا متوازن روپ دیکھنے کو ملتا ہے۔ کلاسیکی غزل کے علائم و رموز سے شناسائی نے ان کی غزل میں ایک تہذیبی وقار پیدا کر دیا ہے۔ مابعد الطبیعیات کے بجائے مابعد الطبیعیات سے جنم لینے والی اخلاقیات ان کی غزل کا بنیادی حوالہ ہے۔ طنز ان کا وہ قلمی حربہ ہے جس نے ان کی غزل کے اخلاقی پہلو کو خوب نمایاں کیا ہے۔ ان کا طنز اکبر کی یاد ضرور دلاتا ہے مگر اکبر کے طنز کی شدت میاں مرغوب صاحب کے ہاں نہیں ملتی۔ انھوں نے جانوروں اور مختلف پرندوں کو علامتی انداز میں پیش کر کے جدید طرز معاشرت کو کھوکھلے پن کی طرف لطیف اشارے کیے ہیں۔ تلمیحات اور محاوروں کا برمحل اور فنکارانہ استعمال زبان و بیان سے ان کی گہری وابستگی کا ثبوت فراہم کر رہا ہے۔

مری قسمت میں لکھا ہے ستارے تاکتے رہنا
طلوعِ صبحِ محشر تک مسلسل جاگتے رہنا
بھٹکنا روشنی میں، ظلمتوں کی آرزو کرنا
تعاقب میں اندھیروں کے مسلسل بھاگتے رہنا
کسی حُسنِ طلب کو بھی بظاہر نیک خوئی سے
مروّت سے بقدرِ غمگساری ٹالتے رہنا
کلی کو بے کلی کیوں ہے گلوں کو عارضہ کیا ہے
چمن کو مضطرب پا کر صبا کا پوچھتے رہنا
سخن کی وادیوں میں کان پر رکھ کر قلم چلنا
ہواؤں میں مثالِ بید مجنوں جھولتے رہنا
تصور میں معطر ہیں حدود چار سو اب تک
کلی کو گدگدانا اور گلوں کو چومتے رہنا
یہی اب تو مرا مرغوبؔ نصب العین ٹھہرا ہے
زمیں کو تولتے رہنا، فلک کو چھانتے رہنا

اب جذبِ دروں میرا اک کام تو کر جانا
جو ظرف کہ خالی ہے اس ظرف کو بھر جانا
یہ قیس کا شیوہ ہے مقصد کی لگن رکھنا
غربت میں سفر کرنا یا شوق سے مر جانا
کس روز نہیں ہوتا ہر اوجِ تکبر پر
خم ٹھونک کے ڈٹ جانا تھک ہار کے گھر جانا
ہاں آج بھی ممکن ہے اس عہدِ جہالت میں
اک ضربِ کلیمی سے فرعون کا ڈر جانا
تخریب کی آندھی سے اے کاش نہ یہ ہوتا
غنچوں کا بھٹک جانا، پھولوں کا بکھر جانا
اغیار کی سازش سے اس کوئے ملامت میں
اک طرفہ تماشا ہے پل پل کی خبر جانا
مرغوبؔ زمانے کے اطوار سے مشکل ہے
بگڑے ہوئے نقشے کا پل بھر میں سنور جانا

دل ہر خیالِ خام سے بیگانہ چاہیے
قلب و نظر کا ایک ہی پیمانہ چاہیے
سورج ترے وقار کا مشرق سے ہو طلوع
ہم کو فروغِ جلوۂ جانانہ چاہیے
اے محتسب تو حُسنِ تدبر کی خیر مانگ
رندوں کو بس کہ لغزشِ مستانہ چاہیے
اے خوابِ دلفریب ذرا سامنے تو آ
اب کس متاعِ شوق کا نذرانہ چاہیے
مانا کہ یہ بھی شوخیِ حُسنِ کلام ہے
''اے شیخ گفتگو تو شریفانہ چاہیے''
شہروں کی تنگ نائے ہے مرغوبؔ سدِ راہ
اس عزمِ بے قرار کو ویرانہ چاہیے

جہاں میں ہوں انوکھا اک جہاں معلوم ہوتا ہے
یہاں نقشِ قدم بھی آسماں معلوم ہوتا ہے
چھلک پڑتا ہے اس کا نقشِ حیرت خود بخود اتنا
نگاہوں سے بھی چھپ کر وہ عیاں معلوم ہوتا ہے
کوئی حکمت یہاں صورت گرِ تقدیرِ عالم ہے
کوئی مقصد پسِ سود و زیاں معلوم ہوتا ہے
ترا چہرہ کسی فنکار کے دستِ مہارت سے
جوابِ آں غزل کا ترجماں معلوم ہوتا ہے
بظاہر تجھ سے کچھ گفتار کی جرأت نہیں ہوتی
مگر تو گفتگو میں مہرباں معلوم ہوتا ہے
جلالت کے سمندر میں تری دستار کا طرہ
شکوہِ خسروی کا بادباں معلوم ہوتا ہے
بجھاتا ہے کوئی مرغوبؔ جب بھی درد کا درماں
مجھے اپنے جنوں کی داستاں معلوم ہوتا ہے

علامت ہے یہ کس سورج کے جشنِ بے حجابی کی
سنہری دھوپ پتوں پر ہے فصلِ آفتابی کی
تجھے کھو کر رہے کفران کی تشکیک میں غلطاں
تجھے پا کر مسرت مل گئی ہے باریابی کی
ترے چہرے کو پڑھ کر علم کا مقصد نکھر آیا
یہاں تعلیم ہوتی ہے ترے حُسنِ کتابی کی

سیدہ شبانہ زیدی/اوکاڑا

جان دے کر بھی ادا ہو تو کوئی بات نہیں　　قرض تو قرض ہے جیسے بھی ادا ہو جائے

سیدہ شبانہ زیدی کا تعلق ادب کی زرخیز سرزمین جس نے ظفر اقبال اسلم کولسری اور مسعود احمد جیسے سپوت پیدا کیے، اوکاڑا سے ہے۔ پیشہ کے لحاظ سے اُستاد ہیں۔ ۲ کتابوں کی مصنفہ ہیں۔ (۱) سلگتے کنول (۲) اک شہر بسا پانی پر۔ لاتعداد مشاعرے پڑھ چکی ہیں۔ ادبی دنیا میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔ ان کی کتابوں پر پاکستان کے علاوہ بیرون ملک سے بھی شعراء کرام نے تبصرے کیے ہیں۔ پاکستان کی مشہور ادبی تنظیم روش انٹرنیشنل کی اوکاڑا میں سینئر نائب صدر بھی ہیں اور پاکستان کے تمام بڑے شہروں میں ان کی کتابوں کی پذیرائی کے سلسلہ میں پروگرام منعقد ہو چکے ہیں۔ ان کی شاعری ہر دور کی شاعری ہے۔ اس میں درد و کرب بھی ہے، غم و ہجر بھی ملن اور جدائی بھی، یاس اور اُمید بھی۔ غزل کے ساتھ ساتھ بڑی خوبصورت نظم بھی کہتی ہیں۔ شبانہ زیدی کی شاعری کا مطالعہ بتاتا ہے کہ انہوں نے اس رمز کو پالیا ہے کہ کون سی بات کہنی ہے، کون سی ان کہی رکھنی ہے، وہ روایت کے دائرے میں رہتے ہوئے جدید حسیت کو برتنے کا سلیقہ جانتی ہیں۔ وہ پھولوں، تتلیوں، خوشبو اور رب اکبر کی قدرت سے پیار کرنے والی شبین لطیف احساسات، سچے جذبات، محبتوں، روایات، مشاہدات و خیالات کا اک شہر آباد دیکھتی ہے۔ جہاں پیار ہی پیار، خلوص ہی خلوص، تصنع اور بناوٹ سے پاک اپنائیت، پاکیزگی نفس اور وحدانیت ہو۔

کبھی گمان سے باہر، کبھی گمان میں ہے
وہ بے نشان جو موجود ہر نشان میں ہے
میں بے زبان نہیں ہوں، بہ پاس حرمت حرف
گڑا ہوا کوئی خنجر مری زبان میں ہے
کبھی زمین کے رشتوں سے کٹ رہے ہیں ہم
قدم زمیں پہ، دماغ اپنا آسمان میں ہے
میں اپنی ذات کی پاتال تک کو چھو آئی
جو ڈوبنے میں نشہ ہے، کہاں اُڑان میں ہے
پہنچ سے اپنی بہت دور جا چکی ہوں تو پھر
کوئی تو عالم نایافت میرے دھیان میں ہے
کوئی تو ہوگی بہر حال مصلحت تیری
وگرنہ تیر تو اب تک تری کمان میں ہے
اب اپنی ذات کا ادراک ہو چلا ہے شبینؔ
کہ میری جان میں ہے، جو بھرے جہاں میں ہے

ہم نے اشکوں سے ترا نام لکھا پانی پر
یوں جلایا ہے سر شام دیا پانی پر
بھیگی پلکوں سے اُبھرتے گئے یادوں کے نقوش
دیکھتے دیکھتے، اک شہر بسا پانی پر
تیرتا آتا ہے پتا جو ہرا پانی پر
منحصر چار عناصر پہ ہے انساں کا وجود
نقش مٹی کا، بنا آگ، ہوا، پانی پر
کسی زردار کے آگے نہ پسارا دامن
ایک خوددار کئی روز جیا پانی پر
کون گزرا ہے اُلجھتا ہوا موجوں سے شبینؔ
دور تک کس کے ہیں نقشِ کفِ پا، پانی پر

شاہ بن جائے کوئی، کوئی گدا ہو جائے
وقت جو چاہے، جسے چاہے، عطا ہو جائے
خود کو پانے کی تمنا میں تھی بے تاب حیات
ایک ہی دُھن تھی اُسے یہ کہ ''ہوا'' ہو جائے
جان دے کر بھی ادا ہو تو کوئی بات نہیں
قرض تو قرض ہے جیسے بھی ادا ہو جائے
اپنی نظروں میں تو پتھر ہے مگر یہ سوچو
دستِ آزر میں جو آ جائے تو کیا ہو جائے
یہ کوئی کھوئی ہوئی رُت ہے شبینہ شاید
فصلِ گل آئے تو ہر زخم ہرا ہو جائے

جو وسعتوں میں عجب بیکراں سا لگتا ہے
یہ میرا ظرف مجھے اک گماں سا لگتا ہے
خدا کرے نہ برس جائے آج یہ بادل
غریب شہر پہ یہ سائباں سا لگتا ہے
بلا رہا ہے مجھے کون آج اپنی طرف
کہ اب وجود مرا جاوداں سا لگتا ہے
اُدھیڑ پن بھی تو حصہ ہے عمر فانی کا
کہ لمحہ لمحہ کوئی امتحاں سا لگتا ہے
یہ ایک میں شجر سایہ دار ہوں بھی تو کیا
کہ سارا شہر ہی اب بے اماں سا لگتا ہے
میں ریزہ ریزہ فضا میں بکھر رہی ہوں شبینؔ
یہ سلسلہ بھی تو تشکیل جاں سا لگتا ہے

مرا گھر اب سمٹتا جا رہا ہے
کئی خانوں میں بٹتا جا رہا ہے
پرانا ہے یہ ملبوس تمدن
سو اب یوں ہے کہ پھٹتا جا رہا ہے
اندھیرے ہیں کہ بڑھتے جا رہے ہیں
اُجالا ہے کہ گھٹتا جا رہا ہے

پیر عبدالرؤف شاہ نبی پوری/ننکانہ صاحب

گرنے والوں کو تھامنا ہوگا یہ بھی کیا کم خدا پرستی ہے

عبدالرؤف شاہ نبی پوری کا شمار اُستاد شعراء میں ہوتا ہے۔ آپ اُردو، فارسی زبانوں میں مہارت رکھتے ہیں۔ کچھ کچھ عربی میں بھی سوجھ بوجھ رکھتے ہیں۔ آپ عرصہ پچاس سال سے شعروادب سے منسلک ہیں۔ آپ نے کوآپریٹو ڈیپارٹمنٹ میں بطور فارم منیجر ملازمت کی اور ریٹائر ہوئے۔ اس کے علاوہ علم طب میں بھی آپ مہارت رکھتے ہیں۔ ادبی تنظیم (وجدان) ننکانہ صاحب کے ممبر اور روح رواں ہیں۔ نیز فیصل آباد کی ادبی تنظیم (بزم ارباب قلم) کے رکن ہیں۔ آپ کی شعری کاوشوں کے تین مجموعے (اُردو غزل، پنجابی کلام اور نعتیہ کلام جس نام (اباریق طہورہ) تجویز ہو چکا ہے، طباعت کے لیے تیار ہیں۔ (عبدالرشید شاہد)

تیری محفل میں کیسی مستی ہے
زُلف بکھری ہے مے برستی ہے
لب خنداں کی خیر ہو ساقی
اک نظر پیار کو ترستی ہے
خودسری تیری، میری لاچاری
کیا بلندی ہے کیسی پستی ہے
گرنے والوں کو تھامنا ہوگا
یہ بھی کیا کم خدا پرستی ہے
خود خریدار بک گئے آخر
وقت کی یہ بھی چیرہ دستی ہے
میرا مفہوم آپ کیا سمجھیں
میری ہستی عجیب ہستی ہے
کچھ تو کہہ کے سُلا رؤف انہیں
غم کے ماروں کو رات ڈستی ہے

رکھتا ہے محو مجھ کو خیالات کا ہجوم
کتنا سکوں نواز ہے اک بات کا ہجوم
ہے زیست کی سطور کے آگے بس اک نشان
جینے بھی دے گا اب یہ سوالات کا ہجوم
یہ ٹوٹ پھوٹ آئینہ فکر و فہم کی
دکھلا رہی ہے مجھ کو مری ذات کا ہجوم
ٹھہرا نہیں ہے ایک ہی منزل پہ یہ بھی
مشکل پسند ہے مرے جذبات کا ہجوم
اے گفتگوئے نیم شبی کچھ رواں بھی ہو
کھونے لگا ہے تاروں کی بارات کا ہجوم
رکھئے رؤف کاوشِ پیہم کا اہتمام
چھٹ جائے گا کبھی تو یہ ظلمات کا ہجوم

کنارِ جو سے تو دریا کے دھارے اچھے ہیں
تری خوشی سے غموں کے سہارے اچھے ہیں
بس ایک تیرا تغافل ہی جان لیتا ہے
کبھی کنائے ترے سب اشارے اچھے ہیں
جو ڈوب جاتے ہیں اوروں کو لے کے ساتھ اپنے
تو اُن سہاروں سے پھر بے سہارے اچھے ہیں
ہمی نے سیکھا نہ کچھ درس آگہی ورنہ
ہمارے دین کے مسلک تو سارے اچھے ہیں
یہ تو نے فرطِ کدورت کہاں سے پائی شیخ
نظر جو ہوتی تو سارے نظارے اچھے ہیں
رؤف دہر کا شکوہ فضول کرتے ہو
زمیں بھی خوب ہے اور سب ستارے اچھے ہیں

یوں ہی چلتے جا رہے ہیں بے قیاس
ہم مسافر اور رستے ہیں اُداس
بے ثمر سوچوں کا جنگل چار سُو
جس طرح پھاگن میں شاخیں بے لباس
تشنگی کے حال کا مت پوچھئے
غم کا صحرا روز بھڑکاتا ہے پیاس
پھر گھٹاؤں میں کسی کی یاد کی
بجلیاں سی گر رہی ہیں آس پاس
میرے بس میں ہو تو جا کر بانٹ لوں
اُس کا غم اُس کی بلا اُس کی تراس
کوئی تو لکھ دو غزل ایسی رؤف
جو بڑھائے اور بھی لفظوں کی پیاس

نظر کے سامنے گرچہ مرے غبار بھی ہے
اسی غبار میں پوشیدہ رہگزار بھی ہے
اُسے کچھ اپنی طبیعت پہ اختیار بھی ہے
وہ نرم خو بھی ہے لیکن ستم شعار بھی ہے
چمن میں دامن خوں رنگ لے کے چلتے ہیں
گلوں کے چاک کا موسم بھی ہے بہار بھی ہے
عجیب وقت پہ بنیاد یہ اُٹھائی گئی
کہ بے ثبات بھی ہے اور اُستوار بھی ہے
نہ اس جہان کی رنگینیوں میں گم ہو جا
کئی جہانوں کا منظر تو اس کے پار بھی ہے
رؤف میرے خرابوں پہ خوش ہو کیوں آخر
مرے وجود کی مٹی ترا غبار بھی ہے

اختشام جمیل شامی/اوکاڑا

جو راہ چھوڑ دی اس پر چلیں تو کیوں آخر
کہ ہم سے ایک خطا بار بار کیسے ہو

ہجر کی رات کا دکھ تو نے کبھی دیکھا ہے
ایسے حالات کا دکھ تو نے کبھی دیکھا ہے
عمر بھر چین سے رہنے جو نہ دیں انساں کو
ان خیالات کا دکھ تو نے کبھی دیکھا ہے
تو نے دیکھے ہیں یہ معیار زمانے کے کبھی
اپنی اوقات کا دکھ تو نے کبھی دیکھا ہے
مسکرائے ہو کبھی اپنی ہی ناکامی پر!
اور پھر ذات کا دکھ تو نے کبھی دیکھا ہے
شامؔ جو چین سے جینے نہیں دیتے تجھ کو
ان سوالات کا دکھ تو نے کبھی دیکھا ہے

دل میں رکھ یا راستہ باہر کا دکھلا دے مجھے
یوں مجھے رسوا نہ کر محفل سے اُٹھوا دے مجھے
اے مرے رہبر نہیں ہوتا ہے مجھ سے اب سفر
کاٹ دے پاؤں کو یا منزل پہ پہنچا دے مجھے
مار ڈالے گی مجھے اب یہ خلش جانِ ادا
زہر دینے کی مجھے کیوں سوجھی بتلا دے مجھے
لمحہ لمحہ مضطرب ہے میری صبح و شام کا
ایک ساعت ہی سکوں کی اب کوئی لا دے مجھے
دستکیں دیتا رہوں گا اس کے در پر میں سدا
اس سے کہہ دو شوق سے ہر بار ٹھکرا دے مجھے

التجاؤں کا اثر ہوتا تھا
کسی قطرے کو گہر ہوتا تھا
ہو گیا رابطہ اسی ظالم سے
یہ بھی دورانِ سفر ہوتا تھا

صاف وہ شکل بھی دیکھی نہ گئی
آنکھ کو آج ہی تر ہونا تھا
وہ جو بازار کی رونق کے ہوئے
ان کا برباد تو گھر ہونا تھا
تیری تعظیم تھی لازم مجھ پر
تیری دہلیز پہ سر ہونا تھا

راہ ہموار ہو گئی ہوگی
تیز رفتار ہو گئی ہوگی
جان واں سے سلامت آ نہ سکی
وقفِ ایثار ہو گئی ہوگی
زندگی تیرے شہر میں آ کر
جنسِ بازار ہو گئی ہوگی
محبت تیری یاد کے خزانوں کی
پھر خریدار ہو گئی ہوگی
میری چاہت تری نگاہوں میں
ان کی دیوار ہو گئی ہوگی
زندگی تیری منتظر ہو کر
کتنی لاچار ہو گئی ہوگی
شامی ہر آرزو مری تجھ بن
غم کا شہکار ہو گئی ہوگی

میں سوچتا ہوں کہ حاصل قرار کیسے ہو
یہ رشتہ پیار اک اب پائیدار کیسے ہو
دلاؤں تجھ کو میں کیسے یقیں محبت کا
مری وفا کا تجھے اعتبار کیسے ہو

بھلانا تجھ کو مرے واسطے نہیں ممکن
کہ اپنے دل پہ مجھے اختیار کیسے ہو
جو راہ چھوڑ دی اس پر چلیں تو کیوں آخر
کہ ہم سے ایک خطا بار بار کیسے ہو
چراغ اس کی امیدوں کے بجھنے والے ہیں
کوئی بتائے اب اور انتظار کیسے ہو

ستم یہ مجھ پہ میری بے بسی نے کیا
جو کام موت کا تھا میری زندگی نے کیا
دکھائی دی نہ مجھے تیری بے وفا صورت
اندھیرا گھر میں مرے آج روشنی نے کیا
کوئی جگہ نہیں محفوظ ظلمت و وحشت سے
یہ حال محشر کا بھی آج آدمی نے کیا
وہی نہیں ہے ستم گر کی اس زمانے میں
سلوک ایسا مرے ساتھ ہر کسی نے کیا
میں شامی آج بھی اس سے وفا میں کرتا ہوں
یہ خستہ حال مجھے جس کی بے رخی نے کیا

منزل کبھی اتنی مری آسان کہاں تھی
اور اس کے لیے مجھ میں بھلا جان کہاں تھی
آتی تھی ہنسی اس کو فقط جیت پہ اپنی
وہ لڑکی مری موت پہ حیران کہاں تھی
مشہور کیا اس کی عنایات نے مجھ کو
ورنہ میری اس شہر میں پہچان کہاں تھی

ساجد علی ساجد/ فیصل آباد

یہاں جو دو گھڑی چہکے وہ کچھ مہماں پرندے تھے
ہمارے گھر کے آنگن میں صدائیں کب ٹھہرتی ہیں

وہ کہہ رہا تھا کہ دل پہ میرے وفا کا کوئی نہ حرف لکھنا
اُجاڑ بنجر ہتھیلیوں پہ حنا کا کوئی نہ حرف لکھنا
وہ اب کہاں دیکھتا ہے پیچھے وہ بند رکھتا ہے سب دریچے
سو چپ ہی رہنا اب آسمان پہ دُعا کا کوئی نہ حرف لکھنا
عذاب حیرت کو سہہ رہے ہیں زمیں کی جنت میں رو رہے ہیں
مرے خدا اب خطا سے پہلے سزا کا کوئی نہ حرف لکھنا
جو دوستی ہو انائیں کیسی یہ نفرتوں کی فضائیں کیسی
انا کے مارو او میرے یارو انا کا کوئی نہ حرف لکھنا
بجھے بجھے سے ہیں چاند تارے اداسیوں میں گھرے ہیں سارے
خدارا روشن دیوں پہ اب کہ ہوا کا کوئی نہ حرف لکھنا

کیوں نہ کرتے حساب یادوں کا
ہم پہ اُترا عذاب یادوں کا
آپ کیجیے شمار دولت کا
کیا کریں گے جناب یادوں کا
خوشبو پھیلے ہمارے آنگن میں
کوئی بھیجو گلاب یادوں کا
ہر ورق پر تمہارا چہرہ تھا
جب بھی کھولا ہے باب یادوں کا
دل کے صفحات سارے خالی ہیں
کس نے لکھا نصاب یادوں کا
پانی پانی ہیں دشت کی آنکھیں
ایسے برسا سحاب یادوں کا
ہستی میری بکھر گئی پل میں
چھوٹا ساجد حباب یادوں کا

محبت میں کبھی وعدے نبھائیں کیوں بتائیں نہ
دیا پھر سے وفاؤں کا جلائیں کیوں بتائیں نہ
یہ کہہ کے کر گئے ہجرت میری بستی کے سب باسی
جو بستی غم سے بستی ہو بسائیں کیوں بتائیں نہ
مسافر کب ٹھہرتے ہیں بہت ویراں سرائے میں
اُسے روکیں اُسے واپس بلائیں کیوں بتائیں نہ
جو اکثر روند کر گزرے ہمارے خواب خیموں کو
ہم اکثر اُن کو دیتے ہیں دُعائیں کیوں بتائیں نہ
نیا کوئی دلاسہ دے کر بہلا لیں گے پھر دل کو
دُکھے دل کو اجی پھر سے دُکھائیں کیوں بتائیں نہ

وفا کے نام لیواؤ وفا تکلیف تو دے گی
گھروندا گر شکستہ ہو گھٹا تکلیف تو دے گی
بڑے گم صم بڑے تنہا لیے کچھ خواب آنکھوں میں
جلا کر دیپ بیٹھے ہو، ہوا تکلیف تو دے گی
حنا میں گوندھ کر لایا کوئی سوغات اشکوں کی
ہمارے ہاتھ زخمی ہیں حنا تکلیف تو دے گی
نکل کر میری دھڑکن سے دعا جینے کی دیتے ہو
ہمیں یوں زندہ رہنے کی دعا تکلیف تو دے گی
ہمیں تم بھول جانے کی ہمیشہ بات کرتے ہو
تمہیں یوں بھول جانے کی ادا تکلیف تو دے گی
تعلق توڑ کر وہ ساتھ ہی یہ کہہ گیا ساجد
تمہیں ترکِ تعلق کی سزا تکلیف تو دے گی

وفا کی سسکیاں سن کر جفائیں کب ٹھہرتی ہیں
دیے کی ہچکیاں سن کر ہوائیں کب ٹھہرتی ہیں
کبھی اُلجھیں یہ کانٹوں سے کبھی پلٹیں یہ پاؤں سے
کسی نادار کے سر پر ردائیں کب ٹھہرتی ہیں
نکل کر میرے ہاتھوں سے یہ رزق خاک ہوتی ہیں
ہمارے ہونٹ چھلنا ہیں دُعائیں کب ٹھہرتی ہیں
کرے ان کا مداوا کیا مسیحا کے نہیں بس میں
ہمیں کچھ روگ ایسے ہیں شفائیں کب ٹھہرتی ہیں
نہ پوچھو ساونی رُت سے کہاں جا کے برستی ہے
یہ پوچھو بانجھ دھرتی سے گھٹائیں کب ٹھہرتی ہیں
یہاں جو دو گھڑی چہکے وہ کچھ مہماں پرندے تھے
ہمارے گھر کے آنگن میں صدائیں کب ٹھہرتی ہیں

غزل: سلیم گورمانی
انتخاب: آفتاب حاصل پور

میں پڑا ہوں ایک ایسے چاہ کے بیچ
جو نہیں قافلے کی راہ کے بیچ
ختم ہے صنعتِ تضاد اُس پر
نور ہے جامۂ سیاہ کے بیچ
عامۃ الناس کی خدایا خیر
ٹھن گئی شاہ زادہ و شاہ کے بیچ
ذہن ہے گویا عرصۂ جنگ گاہ
اور بھگدڑ سی ہے سپاہ کے بیچ

نازیہ رحمٰن ناز

دل میں ایسے ملال باقی ہے   جیسے تیرا خیال باقی ہے

آخر نمی کس آنکھ کی شامل ہوا میں ہے
کیوں اس قدر اُداس سا منظر فضا میں ہے
ہوگی نہ کوئی سانس بھی میرے لیے گراں
جب تک ترے وجود کی خوشبو ہوا میں ہے
آیا ہے کون چاند کے یوں روبرو کہ آج
مارے حیا کے چاند جواب تک گھٹا میں ہے
اب تجھ سے دور رہ کے تو جینا محال ہے
میرا سکونِ زیست تو تیری ادا میں ہے
میرے سوا ہے کون بھلا کس کا نام لوں
ثابت قدم جو آج تک راہِ وفا میں ہے
رہتی ہوں نازؔ اُس کے تصور میں سر بہ خم
پہلا سا وہ خمار بھلا کب انا میں ہے

دل میں ایسے ملال باقی ہے
جیسے تیرا خیال باقی ہے
دیپ آنکھوں کے بجھ نہیں سکتے
ان میں تیرا جمال باقی ہے
دل تو اشکوں سے ڈھل گیا لیکن
یاد اک خال خال باقی ہے
درد بھر تو دیے غزل میں سبھی
صرف کربِ غزال باقی ہے
میری منزل کمالِ فن تو نہیں
ابھی اوجِ کمال باقی ہے
نازؔ ساری غزل ہے خوب مگر
شعر اک لازوال باقی ہے

ایک مدت بعد گویا بوجھ دل سے ہٹ گیا
آج تیری یاد نے یوں انجمن آرائی کی
پھر ملی ہوں آج اپنے آپ سے برسوں کے بعد
خود سے مل کر دور اپنی آپ ہی تنہائی کی
دُنیاداری کے جھمیلوں میں یہ دل والوں سے پوچھ
کس قدر ہے قدر و قیمت گوشۂ تنہائی کی
یہ غنیمت ہے اگر کوئی جو مُڑ کر دیکھ لے
کر رہے ہو بات تم اس دور میں شنوائی کی
جب بھی نازؔ آئی کبھی میں آئینے کے سامنے
آئینے نے پیش میرے سامنے سچائی کی

مجھے پھول پھول کھلا دیا تھا خزاں رسیدہ سی شام نے ترے سامنے
مجھے خوش گماں سا بنا دیا تھا خیالِ خستہ خام نے ترے سامنے
تجھے ڈھونڈا میں نے نگر نگر، تجھے پا سکی نہ مری نظر مرے چارہ گر
سرِ بزم ہی دکھا دیا مرے بے خبر ترے نام نے ترے سامنے
مری زندگی، مری بندگی، مری ہر خوشی، مری آرزو، مرا خواب تو
کہ زباں ادا نہ کر سکی جو کہاں ہے چشمِ خرام نے ترے سامنے
مری جستجو تو ہے تو ہی تو، تجھے میں نے ڈھونڈا ہے کو بہ کو گلی خوبرو
مجھے رکھ دیا ہے بکھیر کر تری جستجوئے دوام نے ترے سامنے
مجھے ہر کلی وہ لگی بھلی، جو تری طرح تھی کھلی کھلی، مری زندگی
یہ سحر سحر سا خیال تھا جو بھلا دیا مجھے شام نے ترے سامنے

اک صدا کی دوری پر

اجنبی نہیں ہیں ہم
اجنبی نہیں ہو تم
پھر بھی دونوں ملتے ہیں
اجنبی فضاؤں میں
اپنی آنکھ میں گم ہیں
رنگ آشنائی کے
اپنی منزلوں کا نشاں
فاصلے جدائی کے
وقت کے سمندر میں
زیست کا تلاطم ہے
کاغذی سفینہ ہے
اور ہم مسافر ہیں
کوئی پوچھتا ہے مجھے
کون سی جگہ ہے یہ
کون سی یہ منزل ہے
شاید اس خرابے میں
وقت کی ندا نے ہمیں
پتھروں میں بدلا ہے
نارسا تمنائیں
میرے خواب کا حصہ
نارسا تمنائیں
تیرے خواب کا حصہ
اجنبی فضاؤں میں
اک صدا کی دوری پر
اپنی خاک روشن ہے
اپنا حرف زندہ ہے

ارشد نعیم/شیخوپورہ

جس کا چہرہ گلاب جیسا ہے
اُس کا ملنا تو خواب جیسا ہے
بات کرتا ہوں اس لیے ان کی
بات کرنا ثواب جیسا ہے
میرا جینا تری جدائی میں
اک مسلسل عذاب جیسا ہے
نشہ اُس کی نشیلی آنکھوں کا
سب سے اچھی شراب جیسا ہے
حال اُس کا بھی آج کل یارو
دلِ خانہ خراب جیسا ہے
اے پیامؔ اُن کی چاہتوں کا پیام
چاہتوں کی کتاب جیسا ہے

اسباب بھی ہے یہی سامان ہمارا
چڑیوں سے مہکتا رہے دالان ہمارا
ہر شخص کو خوشحالی کی دیتے ہیں دُعائیں
ہر شخص ہی کر جاتا ہے نقصان ہمارا
ہر شخص ہی کیوں اس کو مٹانے پہ تلا ہے
دیواروں پہ لکھا ہوا پیمان ہمارا
بیٹھے ہیں فقط ساتھ نبھانے کے لیے ہم
ہر شام کو غم ہوتا ہے مہمان ہمارا
رہتا ہے کسی اور کے قبضے میں ہمیشہ
بھر سکتا نہیں کوئی بھی تاوان ہمارا
اس بات کا دُکھ ہے کہ اشارہ نہیں کاٹا
ہر موڑ پہ ہوتا رہا چالان ہمارا
ہر روز پڑے ہوتے ہیں سب پھول زمیں پر
یہ کون گرا دیتا ہے گُلدان ہمارا

اُس نے دل سے نکال رکھا ہے
کس مصیبت میں ڈال رکھا ہے
غور سے دیکھ اُس کی آنکھوں میں
روشنی کا کمال رکھا ہے
اُس سے ہوتی نہیں ملاقاتیں
اُس نے وعدوں پہ ٹال رکھا ہے
میرے آنگن میں کیا خوشی آئے
سامنے غم کا جال رکھا ہے
وہ ہمیں پوچھنے نہیں آتا
ہم نے جس کو سنبھال رکھا ہے
اُس کی ہم اس ادا پہ ہیں قربان
رابطہ تو بحال رکھا ہے
یہ کسی طور کھل نہیں پاتا
کس نے کس کا خیال رکھا ہے
اُس کدورت سے مجھ کو ملتا ہے
جیسے شیشے میں بال رکھا ہے
جس کا اپنا نہیں جواب کوئی
اُس کے آگے سوال رکھا ہے
اے پیامؔ اُس کی بھی خبر لے لو
کر کے جس نے نڈھال رکھا ہے

میرے ہاتھ میں جب سے ہاتھ تمہارا ہے
میرا تب سے اُونچا اور ستارا ہے
رب راضی تو دُنیا میں سب راضی ہیں
ورنہ دو عالم میں دوست خسارا ہے
مدت بعد بہت سے چہرے یاد آئے
خالی گھر نے مجھ کو آج پکارا ہے
گھرے کالے بادل اور بارش کا زور
ٹوٹی ہوئی کشتی ہے دور کنارا ہے
اُس نے اپنے دشمن کو ہے قتل کیا
نفسِ عمارہ کو جس نے مارا ہے
آنکھ کے اندر کوئی سمندر ہے شاید
اسی لیے تو ان کا پانی کھارا ہے
کاش قلم ہوتا اُن میں اقبال پیامؔ
جن ہاتھوں میں مٹی ہے اور گارا ہے

دوست جب باوفا نہیں ملتا
زندگی کا مزا نہیں ملتا
نام کے رہنما تو ملتے ہیں
کام کا رہنما نہیں ملتا
ڈھندلے لگتے ہیں صاف چہرے بھی
صاف جب آئینہ نہیں ملتا
جا کے دیکھوں گا اُس کی محفل میں
اب وہ ملتا ہے یا نہیں ملتا
غم نصیبوں کی ٹوٹی قبروں پر
کوئی جلتا دیا نہیں ملتا
اے پیامؔ اب ملے جو بے مطلب
وہ بشر ہر جگہ نہیں ملتا

متفرق شاعری (غزلیں)

متوا ہارے اکھیاں
کس کو مارے اکھیاں
بکھرے بکھرے آنسو
تارے تارے اکھیاں
حال سنانے جائیں
کس کے دوارے اکھیاں
اپنا ٹھکانا کر لیں
"رارے پارے" اکھیاں
ہاریں پھر بھی کر لیں
اور اشارے اکھیاں
آنسو آنسو لکھیں
شعر شمارے اکھیاں
نظم نے پوچھا کیا ہے
لفظ پکارے اکھیاں
سوہنا دیس ہے ثاقب
جائیں "ہزارے" اکھیاں

آصف ثاقب/ہزارہ

ڈرنا مرنا اب ضروری ہو گیا ہے
سانسیں بھرنا اب ضروری ہو گیا ہے
اُس فریبی سے کہاں تک جا کے اُلجھیں
جیسے دھرنا اب ضروری ہو گیا ہے
دل کے صحرا کے لیے بھی ٹھنڈا ٹھنڈا
ایک جھرنا اب ضروری ہو گیا ہے
جھونپڑی کی سرد راتوں سے کہوں گا
میرا ٹھرنا اب ضروری ہو گیا ہے
اُس کی چالوں سے بچا کر دل کو رکھنا
گھاؤ بھرنا اب ضروری ہو گیا ہے
مار ڈالے گی محبت بھاگ جاؤ
یعنی ڈرنا اب ضروری ہو گیا ہے
بس اسی کردار میں رہنا پڑے گا
تیرا مرنا اب ضروری ہو گیا ہے
کیا بھلا املاک بھی آ کر کہے گا
پیار کرنا اب ضروری ہو گیا ہے

املاک احمد چدران/اوکاڑا

باہر سے نہیں ٹوٹ کے اندر سے گرا ہوں
اس بار میں اک دست ہنرور سے گرا ہوں
اُن نظروں سے گرنے کا سبب تو نہیں معلوم
بس اتنا پتہ ہے بہت اُوپر سے گرا ہوں
میں اس لیے بھی پوری طرح سو نہیں پایا
اس خاک پہ افلاک کے بستر سے گرا ہوں
تو دھو نہیں پائے گا مجھے اشک بہا کر
دامن پہ ترے، تیرے ہی خنجر سے گرا ہوں
اک بار بھی مانا نہیں وہ زود فراموش
میں کہتا رہا تیرے برابر سے گرا ہوں
میں اُف بھی کروں گا تو چٹخ جائے گا سارا
شیشے سے بنے شخص کی ٹھوکر سے گرا ہوں
رکھ لے گا مری راکھ نمائش کے لیے وہ
میں جلتا ہوا رات کے منظر سے گرا ہوں
اظہر مرے دشمن کو خبر ہو کہ میں اب بھی
تیروں سے نہیں اپنے مقدر سے گرا ہوں

اظہر ادیب/رحیم یار خاں

یہ اُداسی بھی کیا اُداسی ہے
تیز بارش میں روح پیاسی ہے
کچھ نہیں پا رہا ہوں برسوں سے
اُس سے اک بات جو ذرا سی ہے
دھوپ میں دھوپ اوڑھے بیٹھا ہوں
جانے کیسی یہ بدحواسی ہے
اُس کے چہرے کے رنگ میں شامل
چیت کے چاند کی اُداسی ہے
کھڑکیاں بند کر کے بیٹھے ہو
شہر والوں یہ ناسپاسی ہے
شعر ہوتے ہیں صرف اُس کے لیے
جس کو زعم سخن شناسی ہے
دل ٹھہرتا نہیں ہے سینے میں
جانے کس دشت کا یہ باسی ہے
خواب ٹوٹا ہے پھر بھی کمرے میں
اک مہکتی ہوئی ہوا سی ہے
اجنبی ہے مرے لیے اظہر
لیکن آواز آشنا سی ہے

اظہر ادیب/رحیم یار خاں

رہ رہے ہیں آج کل جاپان عامر بن علی
آ گئے ہیں آج پاکستان عامر بن علی
ویسے تو ان کا میاں چنوں میں ہے اپنا مکان
بن کے آئے ہیں یہاں مہمان عامر بن علی
گفتگو ان کی مثالی عاجزی ہے لاجواب
اس لیے تو ہیں ذہین انسان عامر بن علی
سوچ سے لے کر ضیاء احساس سے لے کر شفق
شاعری میں ڈالتے ہیں جان عامر بن علی
بن گئی ہے مسکراہٹ ان کے چہرے کی شناخت
آگہی کا رکھتے ہیں وجدان عامر بن علی

متفرق شاعری (غزلیں)

دست قدرت نے عطا کی ہے انھیں رخشندگی
شاعری کا ہیں حسیں گلدان عامر بن علی
جان و دل سے راہی کہتے ہیں تمھیں خوش آمدید
اہل لاہور، اہل پاکستان عامر بن علی
اقبال راہی/لاہور

لفظوں میں تاثیر بنانی پڑتی ہے
مصرعوں سے توقیر بنانی پڑتی ہے
جاگتی آنکھوں خواب جو ہم نے دیکھے تھے
خود اُن کی تعبیر بنانی پڑتی ہے
گھر آنگن کی یاد اگر بے چین کرے
زنداں کی تصویر بنانی پڑتی ہے
لفظوں کو تحسین نہ کوئی مل پائے
آنکھوں میں تحریر بنانی پڑتی ہے
قدم قدم جب نصب و زیاں کا کتبہ
پھر خود ہی تقدیر بنانی پڑتی ہے
یوں ہی کب کوئی آنکھ کا تارا ہوتا ہے
کچھ نہ کچھ تدبیر بنانی پڑتی ہے
پھر جھنکار پہ رقص بھی جاری رہتا ہے
پہلے تو زنجیر بنانی پڑتی ہے
حجاب عباسی/کراچی

سارے گلے رکھے ہیں اُس نے کتاب کر کے
اب کیا سخن لکھیں ہم اُس کو جواب کر کے
ہم پر ہی قرض اُس کی دلداریاں نہیں ہیں
بیٹھے ہیں فرقتوں کا ہم بھی حساب کر کے
وہ جا چکا ہے پھر بھی خوشبو سی ہر طرف ہے
گزرا ہے وصل موسم دل کو گلاب کر کے

یہ کیا کہ تم بھلا دو ہم کو نہ کچھ سمجھ کر
ہم تم کو پوچھتے ہیں عالی جناب کر کے
اک درد لادوا کو پہلو میں ہینت رکھا
اک شکل کو رکھا ہے آنکھوں میں خواب کر کے
تم فرد زندگی میں قائل حساب کے ہو
چاہا تھا ہم نے رکھنا چاہت نصاب کر کے
اب بھی ہے وقت سن لو پھر ڈھونڈتے پھرو گے
اک شاعرہ یہاں تھی وہ جو حجاب کر کے
حجاب عباسی/کراچی

تری خاطر زمانے کی سبھی رسموں کو توڑیں گے
یہ وعدہ تم سے کرتے ہیں تمھیں ہرگز نہ چھوڑیں گے
زمانے سے ہی سیکھے ہیں سبھی مشکل ہنر ہم نے
بھنور جس سمت سے آئے اسی سمت اس کو موڑیں گے
تری یادوں کے جگنو اس دسمبر میں بھی ڈھیرے سے
تری خوشبو کی چادر کو مرے تن من پہ اوڑھیں گے
جو تیرے ساتھ بیتے ہیں حسیں لمحے مری جاناں
وہی اب زندگی بن کر مری نس نس میں دوڑیں گے
ہم اپنا آپ توڑیں گے بچھڑ کر اُن سے اے راج اب
مگر اک دن وہ آئے گا کہ پھر سے خود کو جوڑیں گے
رئیس راج/ملتان

فلک پہ آخری تارا دکھائی دیتا ہے
مجھے سفر کا اشارا دکھائی دیتا ہے
جو ایک بار کہیں بھی نظر نہیں آتا
کہاں وہ شخص دوبارا دکھائی دیتا ہے
چلو وہاں کہ ذرا آسمان کو چھو لیں
پہاڑ پر جو کنارا دکھائی دیتا ہے

نظر اُٹھا کے فضاؤں میں دیکھتا ہوں جب
جہاز ایک غبارا دکھائی دیتا ہے
تمہارے شہر کی ہر ایک شے مقدس ہے
ہر ایک آدمی پیارا دکھائی دیتا ہے
اسی لیے تو بچھڑنے پہ دونوں راضی ہیں
ہمیں جدائی میں وارا دکھائی دیتا ہے
محبتوں میں کہیں فائدہ بھی ہے لیکن
ہمیں تو صرف خسارا دکھائی دیتا ہے
کبھی خوشی بھی کسی کام کی نہیں ہوتی
کبھی تو غم بھی سہارا دکھائی دیتا ہے
کبھی جو آتا ہے سچ بولنے پہ آئینہ
ہمارا چہرہ، تمہارا دکھائی دیتا ہے
رستم نامی/پشاور

حق سے باطل جب تلک بھی برسرِ پیکار ہے
یہ سمجھ لیجیے نئی اک کربلا تیار ہے
وہ بھی ظالم تھا، مگر اس کا مقدر تھا شکست
اب یزید وقت تو پہلے سے بھی ہشیار ہے
ایٹمی آلات نے بدلا ہے نقشہ جنگ کا
اب نہ وہ تیر و تبر ہیں اور نہ وہ تلوار ہے
چند لمحوں میں مٹا دے بستیاں انسان کی
آدمی کے ہاتھ میں اب ایسا بھی ہتھیار ہے
کس کے در پہ جائیں یہ مظلوم فریادوں کے ساتھ
جس جگہ بھی دیکھیے ظالم کی اب سرکار ہے
فرق غربت اور امارت کا مٹے گا کس طرح
درمیاں میں آج بھی سونے کی اک دیوار ہے

متفرق شاعری (غزلیں)

ابتدا سے آج تک ظالم ہے مسند پر جمالؔ
حق کی رسوائی مگر اب بھی سر بازار ہے

سید علی جمال نقوی/کراچی

ہنستے ہنستے روتے ہیں
ہم دیوانے ہوتے ہیں
نیند سے خالی آنکھوں میں
کتنے سپنے سوتے ہیں
فصل اُسی کی اُگتی ہے
ہم جو خاک میں بوتے ہیں
ہم تو اپنے کاندھوں پر
اپنے لاشے ڈھوتے ہیں
شاہد اپنے شعروں میں
دل کے زخم پروتے ہیں

شاہد عباسی/لاہور

فقط اتنی سہولت مانگتی ہوں
میں جینے کی ضمانت مانگتی ہوں
مسائل سے نمٹ لوں آپ اپنے
میں رب سے اتنی ہمت مانگتی ہوں
اُٹھا کر دیکھتی ہوں جب بھی البم
تو آئینے سے صورت مانگتی ہوں
مرے خوابوں کی فصلیں پک گئی ہیں
گھٹا حسب ضرورت مانگتی ہوں
یہی اول یہی آخر دعا ہے
خدا سے صرف عزت مانگتی ہوں
یہیں رہنا، یہیں جینا ہے مجھ کو
زمانے سے رعایت مانگتی ہوں
خیال اپنا تو رکھ سکتی ہوں خود بھی
میں بچوں سے محبت مانگتی ہوں
میں لوگوں پر نہیں اس بار خود پر
فقط اپنی حکومت مانگتی ہوں

شکیلہ ستارا/واہ کینٹ

پانی میں سدا پھول بہاتے ہوئے گزری
اپنی تو اُسے حال سناتے ہوئے گزری
اک گیت ادھورا تھا فقط ہونٹوں پہ اپنے
وہ گیت ہر اک بزم میں گاتے ہوئے گزری
نادانی میں اک قول کیا تھا جو کسی سے
تا عمر وہی قول نبھاتے ہوئے گزری
اُس نے تو کبھی لوٹ کے آنا ہی نہیں تھا
پھر بھی اُسے آواز لگاتے ہوئے گزری
تعبیر یہاں ملتی نہیں جن کی کسی طور
آنکھوں کو وہی خواب دکھاتے ہوئے گزری
ہم کو تو خبر اور دشاؤں کی نہیں ہے
اپنی تو تری سمت ہی آتے ہوئے گزری
دل اپنا کسی شخص سے بھی مل نہیں پایا
لوگوں سے فقط ہاتھ ملاتے ہوئے گزری

شکیلہ ستارا/واہ کینٹ

دشت میں اک گھر بنانا ہے
اک شجر آس کا لگانا ہے
کر کے روشن تری وفا کے چراغ
زیست کی راہ کو سجانا ہے
زندگی بھر غموں کے سائے میں
اک لہو کا دیا جلانا ہے
تری یادوں کی کہکشاں کو صنم
اپنی پلکوں پہ اب سجانا ہے
ہو کے گم تیری ذات میں ساگر
اپنی ہستی کو اب مٹانا ہے

صدام ساگر انصاری/گوجرانوالہ

دھرتی ماں کی جائے دونوں آؤ سیکھیں پیار
ہم دونوں کے بیچ رہے کیوں نفرت کی دیوار
اندھیارے میں روشن سوچیں سیدھی راہ دکھائیں
جگمگ کرتے سچ کے جگنو منزل تک لے جائیں
من اپنا پاکیزہ رکھیو تن رکھیو ستھرائی
جس کا تن من اُجلا طاہر اس نے جنت پائی
قدرت کا دستور نہیں ہے، یہ ہے تیری بھول
من بگیا میں کانٹے بیچ مانگے سندر پھول
لوبھی سے وہ کوڑھی اچھا جو بانٹے خیرات
اپنی مٹھی بند جو رکھے ٹوٹیں اس کے ہات
یاد کے جو اب کہلائے، جھوٹے دعویدار
ماٹی میں سب مل گئے راجے، رہ گئے لاٹ منار
چل رے بندھو دونوں جا کر مسجد پڑھیں نماز
رب سائیں سے بخشش مانگیں مل کر ہم آواز

ڈاکٹر طاہر سعید ہارون/لاہور

بھوک کم کم ہے، پیاس کم کم ہے
اب تو جینے کی آس کم کم ہے
سانس لیتے تھے ہجر موسم میں
اب یہ موسم بھی راس کم کم ہے
تتلیاں اُڑ گئیں یہ غم لے کر
اب کے پھولوں میں باس کم کم ہے

متفرق شاعری (غزلیں)

دل جو ملنے کی ضد نہیں کرتا
اب یہ رہتا اُداس کم کم ہے
اپنی حالت اُسے بتا نہ سکوں
وہ جو چہرہ شناس کم کم ہے

عمران شناور/چشتیاں

نام لے گا وہ مرا جب کہیں ویرانے میں
گونج اُٹھے گی میرے دل کے نہاں خانے میں
پھر نئے شعر کہوں گی میں ترے ذکر بھرے
پھر تری بات چلے گی کسی افسانے میں
موسم دل تو کئی روز سے بدلا ہوا ہے
اب کوئی دیر نہیں ابر کے چھا جانے میں
دھیان میں آج میرے پھر وہی منظر آیا
میں جسے بھول چکی تھی یونہی انجانے میں
اب کوئی بات کروں گی تو کہے گی دنیا
شام آتی ہی نہیں زخم کے دکھلانے میں

عزت مآب/شیخوپورہ

بات بنتی ہی نہیں معجزہ ہوتا ہی نہیں
سو غم ہجر! تیرا فیصلہ ہوتا ہی نہیں
ہاں اسی آئینہ خانے کا بتایا تھا مگر
میں جدھر دیکھتی ہوں آئینہ ہوتا ہی نہیں
روز ہوتی ہیں تیرے ساتھ بہت سی باتیں
پھر بھی آپس میں کوئی مشورہ ہوتا ہی نہیں
میں بناتی ہوں نئے سلسلے اپنی خاطر
اس کی خاطر تو کوئی سلسلہ ہوتا ہی نہیں
غم کی تہذیب ہوا کرتی ہے عزت لیکن
غم کا دنیا میں کوئی ضابطہ ہوتا ہی نہیں

عزت مآب/شیخوپورہ

زندہ دلی نے زندگی سے ہاتھ دھوئے ہیں
اپنے سرہانے بیٹھ کے ہم آپ روئے ہیں
جانِ عزیز تجھ سے بچھڑنے کے بعد ہم
صغریٰ نہیں قیامت کبریٰ میں کھوئے ہیں
افلاک پر بھی ہے صفِ ماتم بچھی ہوئی
بے وقت کون زیر زمیں جا کے سوئے ہیں
آنکھوں کی آبشار سے پانی دیا انہیں
ہاتھوں سے وہ گلاب جو مٹی میں بوئے ہیں
ہر آنکھ میرے غم میں برابر شریک ہے
تیری لحد پہ آ کے پرندے بھی روئے ہیں
جن آبلوں کو پاؤں میں بھی چھونے نہیں دیے
قسمت نے آبلے وہ مرے دل میں بوئے ہیں
دیکھا انہیں تو موت کے آنسو نکل پڑے
ایسے جوان مرگ بھی کندھوں پہ ڈھوئے ہیں
کس کس نے تیرے نام کی مالا نہیں جپی
تو نے ہماری آنکھ میں آنسو پروئے ہیں
پروردگار تجھ سے یہ ماں کا سوال ہے
کیوں خشکیوں پہ لا کے سفینے ڈبوئے ہیں
(اپنے چھوٹے بھائی کی اچانک وفات پر لکھی غزل)

مسعود احمد/اوکاڑا

آنکھ کی گود میں جو پلتے ہیں
وہ ستارے مدام جلتے ہیں
میں نے چلنا جنہیں سکھایا تھا
اب وہ مجھ سے بھی تیز چلتے ہیں
کس کو ہمراہ لے چلوں اپنے
دھوپ میں لوگ کم نکلتے ہیں
شعر کہہ کر بھی دل فسردہ رہا
غم کہاں شاعری میں ڈھلتے ہیں!
تذکرے پیار کے ہوں آہستہ
ذکر یہ دور جا نکلتے ہیں
موسموں کے مزاج مت پوچھو
دوستوں کی طرح بدلتے ہیں
گوہر اشک چنتے ہیں نصرت
آنکھ کی سیپ سے نکلتے ہیں

نصرت صدیقی/فیصل آباد

اک چاند کہ گردش کو کہیں بھول ہی آئے
اک ابر کہ مستی میں برستا چلا جائے
اک نور کہ ہم سے اُسے دیکھا نہیں جاتا
اک عکس کہ روشن ہوئے جس سے بھی سائے
اک بھول کہ چھپے تری خوشبو کا حوالہ
اک یاد کہ سوچوں میں مری پھول کھلائے
اک شعر کسی نے جو ابھی تک نہ کہا ہو
اک نظم ترے حُسن کی تفصیل بتائے
اک نیند بنے میرے گزشتہ کا حوالہ
اک خواب کہ آئندہ کی تصویر دکھائے
اک سوچ کہ سوچوں کو لگا دے مری گرہیں
اک بات کہ چپکے سے کوئی لوری سنائے
اک تارا کہ رخصت کے سے اذنِ سفر دے
اک اشک کہ رستے میں کوئی آگ جلائے

متفرق شاعری (غزلیں)

اک تتلی کہ ملبوس چرا لائی ہے تیرا
اک پھول جو مہکے تیری خوشبو نظر آئے

ناصر علی سید/پشاور

وصل کو خود کرے بحال تو پھر؟
اب کے ایسی چلے وہ چال تو پھر؟
ملتفت ہو کے پھیر لے آنکھیں
یعنی ایسا کرے کمال تو پھر؟
دل کے ہر گھاؤ میں زبان رکھ دوں
کام آئے نہ عرضِ حال تو پھر؟
حال ہنس ہنس کے پوچھنے والو
سن کے تم کو ہوا ملال تو پھر؟
اب دیے ٹھوکروں پہ رکھتے ہو
بجھ گیا قریۂ جمال تو پھر؟
شہر خوباں ہے، لاکھ چہرے ہیں
کوئی پوچھے تری مثال تو پھر؟
آج کی شام جھوٹے وعدے پر
گر وہ آجائے خوش خصال تو پھر؟

ناصر علی سید/پشاور

گلشن وفا سینچا ہم نے جاں فشانی سے
کام اور کیا لیتے آنسوؤں کے پانی سے
اک مکاں میں نے بھی چن لیا ہے رہنے کو
دوستوں کو شکوہ تھا میری لامکانی ہے
اب تو اس زمیں پر بھی جبر انتہا کا ہے
پہلے خوف آتا تھا قہر آسمانی سے
شاعری کا دریا بھی اک سراب ہے گویا
تشنگی نہیں جاتی شعر کی روانی سے
پھول کے مہکنے سے چاند کے چمکنے تک
استفادہ لگتا ہے تیری نوجوانی سے
ایک خوف انجانا دل سے لپٹا رہتا ہے
راحتیں چرا لی ہیں کس نے زندگانی سے
بے غرض سنائی ہے شاعری زمانے کو
ہم نے خون بیچا ہے سستا کر کے پانی سے
ضبط ہو، تکلم ہو یا کوئی عبارت ہو
سرخرو نہیں کوئی دل کی ترجمانی سے
ٹھوکریں بھی ہوتی ہیں کس قدر اہم نصرت
زندگی بنائی ہے نفرتیں جوانی سے

نصرت صدیقی/فیصل آباد

گو ہم کو نقصان ہمیشہ رہتا ہے
پھر بھی اک امکان ہمیشہ رہتا ہے
ہم منکر اک بار جسے تسلیم کریں
پھر اس پر ایمان ہمیشہ رہتا ہے
ہستی کے چکر میں کچھ بھی ہوتا ہو
مرکز میں انسان ہمیشہ رہتا ہے
جس رستے پر سرمد اور منصور چلیں
وہ رستہ سنسان ہمیشہ رہتا ہے
لاکھ کروں میں دانائی کی بات نیاز
دل میں اک نادان ہمیشہ رہتا ہے

نیازت علی نیاز/مانسہرہ

بے خبر ہوتے ہوئے بھی باخبر لگتے ہو تم
دور رہ کر بھی مجھے نزدیک تر لگتے ہو تم
کیوں نہ آؤں بج سنور کر میں تمہارے سامنے
خوش ادا لگتے ہو مجھ کو خوش نظر لگتے ہو تم
تم نے لمس معتبر سے بخش دی وہ روشنی
مجھ کو میری آرزوؤں کی سحر لگتے ہو تم
جس کے سائے میں اماں ملتی ہے میری زیست کو
مجھ کو جلتی دھوپ میں ایسا شجر لگتے ہو تم
نازؔ تم پر ناز کرتی ہے محبت کی قسم
زندگی بھر کی دعاؤں کا اثر لگتے ہو تم

ناز بٹ/لاہور

تم اگر چاہو کسی کی بے بسی کو دیکھنا
ڈوبتے سورج کی یارو روشنی کو دیکھنا
دیکھنا چاہو حقیقت تم اگر اپنی کبھی
پانیوں پر بلبلوں کی زندگی کو دیکھنا
پیار تم جس سے کرو جس کو بناؤ ہم سفر
بس اسی کی چاہ کرنا اور اُسی کو دیکھنا
معتبر ہوتا نہ کیسے پھر بھلا میرا ہنر
میری فطرت میں ہے شامل ہر کسی کو دیکھنا
حال میرا پوچھتا ہے میرے دل کو توڑ کر
تم ذرا اُس بے وفا کی سادگی کو دیکھنا
ہاتھ سے جانے نہ دینا دامن اُمید کو
تیرگی ہوتے ہوئے بھی روشنی کو دیکھنا
عیب یاروں کے نہ کرنا تم کبھی شاہد شمار
دوستی کے آئینے میں دوستی کو دیکھنا

ہمایوں پرویز شاہد/لاہور

متفرق شاعری (آزاد نظمیں/ نثری نظمیں (حروف تہجی کے اعتبار سے))

نظم

مری سانسو!
رہو چلتی
کہیں تم روٹھ نہ جانا
ابھی جیون ادھورا ہے
مری سانسو
رہو چلتی
کہ مدت سے جسے میں یاد کرتا ہوں
وہ انجانا
مگر اپنا
کنول کے پھول سا چہرہ
مرے جیون میں کھلتا ہے
مری سانسو
رہو چلتی
ابھی دل کی زمیں پر پیاس نے ڈیرے لگائے ہیں
وفا کا ابر برسے گا
یہ تشنہ دل محبت سے ذرا سیراب ہو جائے
مری سانسو
سوائے غم کے میں نے آج تک کچھ بھی نہیں دیکھا
رہو چلتی کہ مجھ کو دیکھ لیتی ہو
خوشی کیا چیز ہوتی ہے
خوشی کا روپ کیسا ہے
مجھے بھی سیکھنا ہے قہقہے کیسے لگاتے ہیں
مجھے بھی وصل کی دولت سے مالا مال ہونا ہے
مری سانسو
رہو چلتی
کبھی تم روٹھ نہ جانا
ابھی جیون ادھورا ہے
ابھی جیون ادھورا ہے

احمد نعیم ارشد

یاد گزیدہ

مجھے یادوں سے نفرت ہے
کہ یادیں زندگی کی راہ کو مشکل بناتی ہیں
طبیعت جب کبھی شاداب ہو، دل گنگناتا ہو
اگر ایسے میں ماضی کا کوئی پل، کوئی لمحہ یاد آ جائے
تو منہ کا ذائقہ کڑوا کسیلا لگنے لگتا ہے
وہ یادیں جب بھی آتی ہیں انا مجروح ہوتی ہے
اور آنکھیں اک بیاباں کا سا منظر پیش کرتی ہیں
جسے میں نے بہت مدت سے محنت سے سمیٹا تھا
وہی شیرازۂ جاں پھر بکھر جانے کو ہوتا ہے
کوئی صورت ہو میرے ذہن کا در بند ہو جائے
جہاں بوسیدہ یادوں نے کسی عفریت کی صورت سے
پنجے گاڑ رکھے ہیں
مجھے یادوں سے نفرت ہے
کہ میرے پاس یادوں کے بہت محدود عنواں ہیں

حجاب عباسی / کراچی

No way no Chance

نہ تم کو فون کرنا ہے
مری جاناں
نہ میں نے خط ہی لکھنا ہے
نہ کوئی کارڈ ہی اب تمہیں ارسال کرنا ہے
نہ تیرے پیار میں جاناں کبھی اپنا
برا اب حال کرنا ہے
مگر جاناں
یہ طے ہے اب...... یہ لازم ہے
مرے گیتوں
مری غزلوں...... مری نظموں
کے ہر اک لفظ میں تم ہو گی ہر دم...... بس
تمہی ہو گی

رئیس راج / ملتان

شاید

ہزاروں خواہشیں
باندھی تھیں
اس جمہوریت سے
ہم غریبوں نے
کہ اپنے دن پھریں گے
اور خوشیاں
لوٹ آئیں گی
غریبوں، مفلسوں، محنت کشوں
اور ان کسانوں کا
امیروں اور وڈیروں
کی طرف سے
اب نہ استحصال ہو گا
اور نہ کوئی یرغمال ہو گا
مگر حالات کہتے ہیں
کہ جیسا ہر دفعہ ہوتا ہے
کچھ ایسا ہی ہو گا
ہمارا خواب

متفرق شاعری (آزاد نظمیں، نثری نظمیں)

شاید!

اب کے بھی پورا نہ ہوگا

سید علی جمال نقوی/کراچی

مزاحیہ کلام

اندر کی خواہش

میری بیوی کیسی ہے؟
وہ تو اتنی اچھی ہے
وہ تو اتنی اچھی ہے
اکثر میرا دل یہ چاہے
اُس کے جیسی
دو ہو جائیں

ایک روزہ بھی نہیں کھولا

عیدالفطر پہ اس ڈبلے کو
اس بیمار سے، دبلے پتلے ڈھانچے کو
ڈبلے پتلے، انجر پنجر کو دیکھا تو محسوس ہوا
جیسے اُس نے
روزے سارے رکھے ہیں
لیکن کھولا اک بھی نہیں

بیوی کی ڈانٹ

جھڑکیاں سہتا ہوں دفتر میں سدا
ڈانٹ لیتی ہے جو بیوی بھی مجھے
دوسروں کو اس میں کیا تکلیف ہے؟

چوہے کی چڈی

جھیل کے پانی میں بیٹھے اک ہاتھی سے
اک چوہا بولا
''باہر آؤ''
ہاتھی بولا'' کیوں بھئی کیوں؟''
چوہا بولا
''کل سے میری چڈی گم ہے،
دیکھنا ہے کہ کہیں یہ چڈی،
تم نے تو نہیں پہنی ہے؟''

محمد ممتاز راشد/دوحہ قطر

محبت نور ہے جاناں
زمانہ اس کی خواہش میں ازل سے چور ہے جاناں
محبت نور ہے جاناں
محبت نور ہے جاناں
رُخِ مہتاب سے روشن
نظر میں کھلنے والے سبزۂ شاداب سے روشن
ستاروں سے کہیں بڑھ کر چمک اس کے جلو میں ہے
جو آب و تاب اس میں ہے کہاں سورج کی ضو میں ہے
یہ نخلِ عشق پر جیسے وفا کا نور ہے جاناں
محبت نور ہے جاناں
محبت نور ہے جاناں
یہ جس دل میں اُتر جائے اُسے معمور کر جائے
سراپا رنگ کر جائے تمناؤں سے بھر جائے
یہ ایسا کیف ہے جو ہر قدم زندگی پرنور کرتا ہے
اُتر کر روح میں اس کے اندھیرے دور کرتا ہے
یہ وہ احساس ہے جو ہر گھڑی بھرپور ہے جاناں
محبت نور ہے جاناں
محبت نور ہے جاناں

نازبٹ/لاہور

آرزو

(نثری نظم)

اک اسی آرزو میں جیئے ہیں روز و شب
کہ مجھے تو ملے کہیں ملے بس تو ملے
تو پاس ہو تو جاناں
ترا ہاتھ تھامے چل پڑوں کسی اجنبی سے
دیار میں جہاں پھولوں کے جیسے چہرے ہنستے ہوں
مسکراتے ہوں غم دوراں کے معنی سے وہ ناواقف
ہوں جہاں تمہاری آنکھ کے سیاہ تل کے جیسی
گہری جھیلیں ہوں پریاں وہاں اترتی گنگنایا کرتی ہوں
ہم مبہوت سے اس سے میں کھو جائیں
تتلیوں کے جیسے رنگین پر ہوں اپنے کسی پھول میں
چھپ جائیں گم ہوں زمانے کی نظروں میں ایسے
ڈھونڈنا چاہیں بھی نظریں ہمیں تلاش نہ پائیں
اک اسی آرزو میں جیئے ہیں روز و شب
کہ جاناں مجھے تو ملے کہیں ملے بس تو ملے......

ارسہ مون/شاہ کوٹ

سنو جاناں
اک جگنو آیا تھا مرے گھر آنگن میں
تمہیں ڈھونڈتا ہوا
اس سے پہلے کہ تم نہ ملتے اُسے
یونہی خفا خفا سا
اپنے گھر کا راستہ بھول جاتا
وہ کہیں
پہلی شام کا پہلا جگنو
ہم نے پکڑا اور
تمہارے نام کیا

ارسہ مون/شاہ کوٹ

ادھوری محبت

جویریہ ایوب/کوہاٹ

حرا کی آنکھ اچانک کھلتی ہے اور بلال کی تصویر پر پڑتی ہے۔ وہ بلال کی تصویر کو دیکھ کر مسکراتی ہے اور تصویر کو اُٹھا کر گلے لگاتی ہے۔ ارے میں جلدی سے تیار ہو جاؤں میں نے تو بلال کے لیے کھانا بھی بنانا ہے۔ جب کچن میں کھانا بنانے لگی تو امی آئی اور کہنے لگی کہ آج پھر کیا بلال کے لیے بنا رہی ہو۔ امی میں اس کے لیے بریانی بنا رہی ہوں۔ کیا بلال کی امی اس کے لیے کھانا نہیں بناتی ہے۔ نہیں امی ایسی بات نہیں ہے۔ جیسے آپ کے ہاتھ کا کھانا ابو کو پسند ہے اسی طرح بلال کو میرے ہاتھ کا کھانا پسند ہے۔ جیسے ہی میں کچن سے نکلی اور تیار ہو کر باہر نکلنے ہی والی تھی کہ ابو کی آواز آئی۔ بیٹا کہاں جا رہی ہو اور ہاتھ میں کیا ہے۔ ابو یہ بریانی ہے بلال کو بہت پسند ہے۔ آج بلال کی ریس ہے میں بس وہیں جا رہی ہوں۔ اچھا بیٹا جاؤ اور وقت پر گھر آنا۔ جی ابو کوشش کروں گی۔ جب میں کالج پہنچی تو بلال کی ریس شروع تھی۔ بلال بہت تیزی سے بھاگ رہا تھا۔ اس کی تیز رفتار دیکھ کر مجھے یوں لگا کہ ریس تو صرف بلال ہی جیتے گا۔ اچانک بلال کی رفتار آہستہ ہو گئی اور وہ گر گیا اور زخمی ہو گیا۔ میں اس کی جانب بھاگ کر گئی اور اسے ہسپتال لے گئی۔ میں نے اس کی امی کو ایس ایم ایس کیا اور وہ بھی وہاں آ پہنچی۔ چیک اپ کرنے کے بعد ڈاکٹر نے بلال کی امی کو بلایا تو میں بھی انہی کے ساتھ چلی گئی۔ ڈاکٹر نے اس کی امی کو کہا کہ میں نے آپ سے پہلے بھی کہا تھا کہ بلال دل کا مریض ہے اور میں نے اسے منع کیا تھا کہ وہ ریس نہ لگائے۔ کیونکہ ریس کی وجہ سے اس کی جان جا سکتی ہے۔ ڈاکٹر کی یہ بات سنتے ہی میری آنکھیں نم ہو گئیں۔ ڈاکٹر نے بلال کو ڈسچارج کر دیا۔ جب میں اور بلال کمرے سے باہر آئے تو اتنے میں میری امی بھی آ پہنچی اور بلال سے پوچھنے لگی کہ کیسے ہو بلال۔ میں ٹھیک ہوں۔ جہاں حرا ہو وہاں مجھے کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ میں مسکرانے لگی اور بلال کی Reports لینے چلی گئی۔ میری امی بلال کے ساتھ ہی تھی۔ امی نے بلال سے کہا کہ تم میری بیٹی کو اپنے بغیر جینا سکھاؤ۔ اللہ نہ کرے کہ اگر تمہیں کچھ ہو گیا تو میری حرا جیتے جی مر جائے گی۔ اتنے میں میں آ گئی اور میری امی چپ ہو گئیں۔ ہم گھر چلے گئے۔ جب میں اپنے گھر پہنچ گئی تو بلال کی طبیعت پوچھنے کے لیے میں نے اسے کال کی۔ اس نے اپنا نمبر Busy کر دیا۔ میں نے اسے دوبارہ کال کی اس نے پھر سے اپنا نمبر busy کر دیا۔ کل صبح جب میں اس کے گھر گئی تو بلال اپنے کمرے میں نہیں تھا۔ میں اس کی امی کے پاس گئی تو پتہ چلا کہ بلال جا چکا تھا اور اسلام آباد کی یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔

میں بھی اسلام آباد روانہ ہو گئی اور اسی یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ کچھ دن تو اس کی یادوں کی وجہ سے میں نہ کچھ پڑھتی تھی اور نہ ہی کچھ مجھے سمجھ آتا تھا لیکن آہستہ آہستہ میں نے اپنی توجہ پڑھائی کی طرف کر دی۔ میں نے خوب محنت کی۔ آخر مجھے اپنی محنت کا پھل مل ہی گیا اور میں نے اپنی یونیورسٹی میں Top کر لیا۔ جس دن نتیجہ نکلا اور مجھے اسٹیج پر بلایا گیا تو بلال مجھے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ Function ختم ہونے کے بعد جب میں بلال کے پاس گئی تو مجھے غصے سے دیکھ کر کہنے لگا کہ تم یہاں کیوں آئی ہو تم واپس چلی جاؤ۔ بلال کیا تم بھول گئے تھے کہ ہم ہمیشہ ایک ہی ساتھ فیصلے کرتے تھے۔ تم نے اتنا بڑا فیصلہ کیسے کر دیا۔ یہ سن کر بلال اپنے کمرے میں چلا گیا۔ بلال اور اس کا دوست اپنے کمرے میں سونے کی تیاری کر رہے تھے۔ اس کے دوست نے اسے کہا کہ حرا تم پر مرتی ہے۔ اگر تم اس سے سچے دل سے محبت نہیں کرتے تو کیوں اسے اتنا تڑپاتے ہو۔ بلال نے کہا کہ میں نے اسے ہمیشہ سچے دل سے چاہا ہے۔ بلال کا دوست اسے کہنے لگا کہ تم اور تمہارا پیار دونوں بزدل ہیں۔ حرا کو چھوڑ دو۔ کیونکہ میرے دل میں بھی اس کے لیے محبت کے جذبات اُٹھنے لگے ہیں۔ یہ بات سن کر بلال نے اپنے دوست کو گریبان سے پکڑ لیا۔ حرا صرف میری ہے پیار کرنا تو دور کی بات تم اس کو آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتے۔ اچھا اتنا پیار کرتے ہو تو چلو آج ریس لگاتے ہیں۔ ریس جو جیتے گا حرا اس کی ہوگی۔ آج دیکھتے ہیں کہ ہم دونوں میں سے کس کی محبت سچی ہے۔ وہ دونوں ریس لگانے نکلے اور ریس شروع کر دی۔ حرا کی دوست نے بلال کو دیکھا تو وہ دوڑتی ہوئی حرا کے پاس گئی اور کہا کہ بلال پھر سے ریس لگا رہا ہے۔ حرا چیخ کر بولی کہ اگر اس نے ریس لگائی تو وہ مر جائے گا۔ جب وہ بلال کے پاس پہنچی تو بلال ریس جیت چکا تھا اور اس کے منہ سے خون آ رہا تھا اور وہ زمین پر گر پڑا تھا۔ حرا اور اس کا دوست بلال کو ہسپتال لے گئے۔ جب وہاں بلال ہوش میں آیا تو حرا سے کہنے لگا کہ مجھے یہاں ہسپتال میں بیڈ پر نہیں مرنا۔ حرا مجھے پتا ہے کہ اب میں زندہ نہیں رہوں گا۔ حرا اسے لان میں لے گئی اور وہ حرا کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا۔ حرا تمہیں یاد ہے کہ میں نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ میں اپنی زندگی کی آخری دس سانسیں تمہارے نام کر دوں گا۔ یہ کہتے ہی وہ دم توڑ گیا۔

بلال حرا کو چھوڑ کر چلا گیا لیکن آج بھی حرا اس کی یادوں میں جیتی ہے۔

اچھی صحبت برے حالات

معصومہ بتول/کوہاٹ

جن دنوں میرے شوہر ایک حادثے میں انتقال کر گئے میری عمر تیس برس تھی اور چار بچوں کا ساتھ تھا جو اسکول میں زیر تعلیم تھے۔ بیٹے طاہر علی کی عمر بارہ برس تھی اور ساتویں جماعت کا طالب علم تھا۔ باقی تینوں علی سے چھوٹے تھے۔ جب کفالت کی ذمہ داری مجھ پر آ پڑی تو فکر سے راتوں کی نیند اُڑ گئی۔ بھائی اور والد بھی نہ تھے۔ جمع پونجی کب تک ساتھ دیتی گھر کرائے کا تھا۔ میرے میاں کے دوست صغیر ایک روز ہماری خیریت دریافت کرنے آئے تو میں نے اپنی پریشانی کا اظہار ان کے سامنے کر دیا۔ انہوں نے کہا آج کل خواتین کانسٹیبل کی آسامیاں نکلی ہیں۔ آپ میٹرک پاس ہو کہو تو صاحب سے کہہ کر آپ کو نوکری دلوا دوں؟ پہلے میں جھجکی کہ اگر میاں ہوتے تو کبھی مجھ کو پولیس کی نوکری نہ کرنے دیتے لیکن اب حالات اور تھے۔ لہٰذا کچھ سوچ کر حامی بھر لی۔ صغیر بھائی نے فارم پُر کیا اور یوں مجھے ملازمت مل گئی۔ انہی کی کوششوں سے پھر رہنے کو سرکاری کوارٹر بھی ملا اور میں پولیس کالونی میں رہائش پذیر ہو گئی جہاں میرے بچوں کو بغیر فیس تعلیم کی سہولت میسر آ گئی۔

مجھ کو ملازمت کرتے ہوئے تین سال ہوئے تھے کہ ایک روز بہنوئی صاحب کا فون آ گیا۔ تمہاری بہن سخت بیمار ہے منہ دیکھنا چاہتی ہو تو جلد پہنچو۔ یہ اطلاع ملتے ہی میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ یہ میری ایک ہی بہن تھی گھبرا نہ جاتی تو کیا کرتی۔ بچوں کو ان کی دادی کے حوالے کر کے میں فوراً ہی بذریعہ بس اسلام آباد روانہ ہو گئی۔

بس کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ بس میں ایک ہی سیٹ خالی تھی۔ میرے ساتھ ایک خاتون بیٹھی تھی۔ درمیان میں رستہ تھا اور برابر میں یہ سیٹ تھی جو خالی تھی۔ اسی نشست پر ایک نوجوان کھڑکی کی طرف پہلے سے موجود تھا۔ ایک نوجوان لڑکی عمر بھی سترہ برس ہو گی۔ چادر سے آدھے منہ کو ڈھانپے سوار ہوئی۔ لڑکی نے ایک ہی نظر میں بس کا جائزہ لیا۔ پھر اس خالی نشست پر بیٹھ گئی جس پر وہ نوجوان پہلے سے موجود تھا جو شکل و صورت سے نہایت شریف نظر آ رہا تھا۔ کسی اچھے گھرانے کا لگ رہا تھا۔ ایک لڑکی کو اپنے ساتھ بیٹھتے دیکھ کر کچھ پریشان نظر آنے لگا۔ لڑکی نے عقلمندی کی کہ ہاتھ میں جو بیگ پکڑ رکھا تھا اسے نوجوان اور اپنے درمیان رکھ کر حد فاصلہ قائم کیا۔ بس چل پڑی کچھ مسافر باتوں میں مشغول ہو گئے۔ جلد ہی میری توجہ کا مرکز میرے دائیں جانب والی لڑکی بن گئی۔ وہ کچھ گھبرائی ہوئی لگ رہی تھی اور بے آرامی محسوس کر رہی تھی۔ بار بار اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ وہ خود کو بے حد غیر محفوظ محسوس کر رہی تھی۔ پولیس میں نوکری کرنے کی وجہ سے میری چھٹی حس تیز ہو گئی تھی۔ مجھے بار بار بہن کا خیال آ رہا تھا جی تو چاہتا تھا کہ یہیں سے اُڑ کر بہن کے پاس پہنچوں لیکن مجبوری تھی۔ کئی بار نگاہوں نگاہوں میں بس کے مسافروں کا جائزہ لیا۔ کئی مسافر اگلی منزل پر اُتر گئے اور سیٹیں خالی ہو گئیں۔ لڑکی چاہتی تھی کہ کوئی دوسری سیٹ منتخب کر لے لیکن شاید اس نے اُٹھنا مناسب نہ سمجھا۔ وہ نوجوان بت کی طرح بیٹھا تھا۔ وہ اس لڑکی کے بیٹھنے کی جرات پر گھبرایا ہوا تھا۔ بس ایک سٹاپ پر تھوڑی دیر کے لیے رُکی تاکہ مسافر کچھ کھا پی لیں اور نمازی نماز پڑھ لیں۔ کافی مسافر اُترے لیکن وہ لڑکی نہ اُتری۔ وہ نوجوان بھی بیٹھا رہا اور میں نے بھی اُترنے کی حاجت نہ کی اور میں نہیں اُتری۔ اچانک لڑکی نے نوجوان سے سوال کیا آپ کہاں جائیں گے؟

میں لاہور جا رہا ہوں اس نے جواب دیا اور آپ؟

میں اسلام آباد جا رہی ہوں اپنے ماموں جان کے گھر۔ لڑکی نے جواب کو مزید بڑھا دیا۔ تمہارے ساتھ کون ہے؟ لڑکے نے پوچھا۔

اس سوال پر لڑکی نے خاموشی اختیار کی اور پہلو بدلنے لگی۔ تبھی مجھ کو شک ہوا کہ یہ لڑکی گھر سے بھاگی ہوئی ہے۔ ایسی لڑکیوں کو پکڑنا ہمارا روزمرہ کا معمول تھا۔ میں نے غور سے لڑکے کی طرف دیکھا جو مجھے بے حد معصوم نظر آیا۔ جس کا اس لڑکی سے دور کا واسطہ بھی نہ تھا۔ میرے ذہن میں جو غلط خیال اُبھرا تھا وہ مٹ گیا۔ بھری ہوئی بس میں لڑکی کو بے آسرا دیکھ کر اپنی بہن کی بیماری کو فراموش کر دیا اور پوری توجہ اس نادان پر مرکوز کر دی۔ اب طرح طرح کے سوالات میرے ذہن میں اُبھرنے لگے۔ اگر یہ لڑکی غلط ہاتھوں میں پہنچ گئی تو اس کا کیا حشر ہو گا؟ یہ اکیلی گھر سے نکلی ہی کیوں؟ کیا یہ سچ میں ماموں کے گھر جا رہی ہے؟ میں اسی خیالات میں گم تھی کہ لڑکی نے مدھم آواز نکالی اور کہا بھائی کیا آپ میرے ساتھ اسلام آباد اُتر جائیں گے؟ مجھے اپنے ماموں کا گھر تلاش کرنا ہے جو میں

نئی آوازیں

رات کے اندھیرے میں نہیں کر پاؤں گی۔ لڑکے نے لڑکی کی بات سن کر اپنی نگاہیں جھکا لیں جیسے کوئی بھائی اپنی بہن کا ننگا سر دیکھ کر نظریں پھیر لیتا ہے۔ وہ کسی سوچ میں گم ہو گیا۔ تھوڑی دیر تک لڑکی جواب کی منتظر رہی۔ اُس دوران لڑکے نے کچھ فیصلہ کر لیا اور کہا کہ بے فکر رہو میں تم کو تمہارے ماموں کے گھر پہنچا دوں گا۔ بس کنڈیکٹر واحد شخص تھا جس کو علم تھا کہ یہ لڑکی اکیلے سفر کر رہی ہے۔ جب اگلے سٹاپ پر لڑکے نے اس اکیلی مسافر کو کھانے پینے کی اشیاء لا کر دیں تو کنڈیکٹر کے کان کھڑے ہو گئے۔ لڑکے کا ضمیر صاف تھا۔ لہٰذا اُسے کوئی خوف نہ تھا۔ اُس نے اچھی نیت کے ساتھ لڑکی کو منزل تک پہنچانے کی ٹھان لی۔ لہٰذا لاہور پر اُتر جانے کی بجائے بس میں موجود رہا۔ اس نے کنڈیکٹر سے کہہ کر اپنا اسلام آباد کا ٹکٹ تو بنا دیا لیکن ڈرائیور کے کان میں کوئی بات بھی کہی اور ڈرائیور نے مڑ کر بغور لڑکے اور لڑکی کا نگاہوں ہی نگاہوں میں جائزہ لیا۔ راستے میں ایک جگہ روڈ حادثے کے باعث دو گھنٹے بلاک ہو گیا۔ میں پولیس والی تھی میرے پاس پولیس کے محکمے کا شناختی کارڈ تھا۔ لہٰذا مجھے بھی کسی بات کا خوف نہ تھا۔ بہنوئی کو اطلاع دے دی تھی کہ اڈے پر آ جانا۔ میں نے لڑکے سے سوال کیا بیٹا تم کیا کرتے ہو؟ جی میں کیڈٹ ہوں۔ ملتان سے ایک دن کے لیے لاہور اپنے تایا کے گھر رُکنا تھا لیکن اب سیدھا اسلام آباد آ گیا ہوں اور کل صبح اکیڈمی رسالپور چلا جاؤں گا۔ شاباش بیٹا اور یہ لڑکی جو تمہارے ساتھ ہے؟ جی یہ میرے ساتھ نہیں اکیلی ہے اس لیے خوفزدہ ہے۔ میں اسے اس کے گھر پہنچانے اسلام آباد آ گیا ہوں۔ ورنہ مجھے لاہور اُترنا تھا۔ تم نے یہ ذمہ داری کیوں لے لی بغیر کچھ جانے بوجھے کہ یہ کون ہے کہاں سے آئی ہے اکیلے سفر کیوں کر رہی ہے؟ اس نے مجھے بھائی کہا تو میں نے اپنا اخلاقی فرض سمجھا کہ اس کو اس کی منزل تک چھوڑنے جاؤں۔ آپ کو پتہ ہے کہ زمانے خراب ہے۔ مجھے معلوم ہے بیٹا۔

تمام مسافر بس سے اُتر گئے تو ہم بھی اُتر گئے۔ یہ دونوں آخر میں اُترنے لگے۔ تب کنڈیکٹر نے ان کو للکارا۔ ٹھہرو! پھر لڑکے سے مخاطب ہوا تم اپنی خیریت چاہتے ہو تو چلے جاؤ۔ ہم جانتے ہیں یہ تمہارے ساتھ نہیں ہے۔ یہ میرا بھائی ہے لڑکی خوفزدہ ہو کر بولی۔ جھوٹ مت بولو کنڈیکٹر کے ساتھ ڈرائیور نے بھی آواز ملائی۔ تم اس کو اغوا کر لائے ہو کیا لگتی ہے تمہاری؟ اس دھمکی پر نوجوان خوفزدہ نہ ہوا۔ چلو اُتارو لڑکی کو ورنہ پولیس میں اطلاع کر دوں گا۔ لڑکی ابھی تک بس سے نہ اُتری تھی۔ ڈر تھا کہ یہ کہیں بس نہ چلا دیں۔ میں آگے بڑھی اور بیچ میں مداخلت کی۔ میں نے کہا سنو! لڑائی مت کرو۔ لڑکی کو میرے حوالے کر دو۔ تم کون ہو خالہ لڑکی کو لے جانے والی۔ کیا تم لڑکی کی کچھ لگتی ہو؟ ہاں! میں لیڈی کانسٹیبل ہوں۔ یہ کہہ کر میں نے اپنا کارڈ نکالا تو وہ رک گئے۔ میں نے بس میں جا کر لڑکی کو نیچے اُتارا۔ وہاں پر موجود لوگ جمع ہو گئے بولے کیا ہوا بھئی۔ میں نے کہا لڑکی میری تحویل میں ہے۔ میں اس کو گھر پہنچا دوں گی۔ پھر میں نے لڑکے کو کہا کہ بیٹا ٹیکسی روکو۔ اتنے میں مجھے بہنوئی دکھائی دیے جو سواری ساتھ لائے تھے۔ تب میں نے لڑکے کو کہا کہ تم بھی ہمارے ساتھ آؤ۔ لڑکی کے بتائے ہوئے ایڈریس پر ہم پہنچے۔ رات کے دو بج گئے تھے۔ ہم نے بار بار گھنٹی بجائی لیکن گھر سے جواب نہ ملا۔ میں ان دونوں مہمانوں کے ساتھ بہنوئی کے گھر آ گئی۔ رات کو ہم سو گئے۔ صبح دوبارہ لڑکی کے رشتہ داروں سے رابطہ کیا اور اسے ماموں کے گھر پہنچا دیا۔ البتہ اس نے یہ نہ بتایا کہ وہ کیوں اکیلی گھر سے ماموں کے گھر آئی تھی۔ بعد میں رابطہ کرنے کے بعد اس کی ممانی نے بتایا کہ سوتیلی والدہ کی وجہ سے وہ مایوس ہو کر گھر سے اکیلی نکل پڑی تھی۔ وہ کسی لڑکے کے ساتھ نہیں نکلی تھی۔ نوجوان اپنا اخلاقی فریضہ نباہ کر اکیڈمی چلا گیا۔ اس نے مجھ سے التجا کی کہ اس معاملے کو پولیس تک نہ پہنچاؤں۔ اس طرح لڑکی کی بدنامی ہوگی۔ دوسرا یہ کہ اس کا مستقبل خطرے میں پڑ سکتا ہے۔ میں نے اس کی شرافت کو دیکھتے ہوئے بھرم رکھا۔ یوں ایک لڑکا سزا سے بچ گیا اور ایک نادان لڑکی کسی ناگہانی حادثے کا شکار ہونے سے بچ گئی۔

خصوصی شکریہ: ''ارژنگ'' کے سلسلے گوشۂ نئی آوازیں میں ہم نئے لکھنے والوں کی تخلیقات شامل کرتے ہیں۔ اس بار ہم کوہاٹ کی معروف افسانہ نویس بی بی حلیمہ بشریٰ کے شکر گزار ہیں جن کے توسط سے ہمیں نئے لکھنے والوں کی تخلیقات دستیاب ہوئیں۔

ادبی خبریں/تقریبات

مقصود عامر بھی چل بسے

ممتاز شاعر ادب تنظیم "کردار" اور "کردار sms" سروس کے بانی وچیئرمین مقصود عامر گزشتہ دنوں لاہور میں خالق حقیقی سے جاملے۔ مرحوم گزشتہ تین دہائیوں سے لاہور میں مقیم تھے۔ انہوں نے بے شمار ادبی تقریبات کا اہتمام کیا۔ وہ شعراء کرام کی سالگرہ خصوصی اہتمام سے منایا کرتے تھے۔ بہت اچھے شاعر اور خوبصورت انسان تھے۔ اُن کی وفات سے ادبی برادری کو گہرا دکھ اور صدمہ ہوا۔ ادارہ "ارژنگ" اور پوری ٹیم مرحوم کی مغفرت کے لیے دُعا گو ہے۔

انتقالِ پُرملال

فیصل آباد میں مقیم مثال پبلشرز کے چیف ایگزیکٹو محمد عابد کے والد گرامی گزشتہ دنوں قضائے الٰہی سے وفات پا گئے۔ مرحوم کی عمر 65 برس تھی۔ ادارہ "ارژنگ" اور اس کی ٹیم دُعا گو ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین

معروف مزاح نگار کالم نگار اور شاعر گل نوخیز اختر کو صدمہ

گزشتہ دنوں معروف کالم نگار اور شاعر گل نوخیز اختر کے والد گرامی مشیت الٰہی سے وفات پا گئے۔ ادارہ "ارژنگ" اور اس کی ٹیم گل نوخیز اختر کے غم میں برابر کی شریک ہے۔ دعا کرتے ہیں اللہ تعالیٰ مرحوم کے جنت الفردوس میں درجات بلند کرے اور لواحقین کو صبر جمیل عطا کرے۔ آمین

ڈاکٹر اشفاق احمد ورک کو صدمہ

ممتاز مزاح نگار و شاعر ایف سی کالج کے شعبہ اُردو کے استاد ڈاکٹر اشفاق احمد ورک کو اپنی والدہ ماجدہ کی رحلت کا صدمہ اُٹھانا پڑا۔ ادارہ "ارژنگ" اور اس کی ٹیم ڈاکٹر اشفاق احمد کی اس اندوہ گھڑی میں شریک ہوتے ہوئے مرحومہ کی مغفرت اور آخرت میں بلند درجات کے لیے دُعا گو ہے۔

اصغر مغل کو صدمہ

رپورٹ (احمد جلیل) پچھلے دنوں عالمی شہرت کے حامل آرٹسٹ اور خطاط محمد اصغر مغل کی اہلیہ قضائے الٰہی سے وفات پا گئیں۔ علمی ادبی اور ثقافتی حلقوں نے اس ناگہانی سانحہ ارتحال پر اُن سے گہرے دکھ کا اظہار کیا ہے۔ خدا سے دعا ہے کہ وہ مرحومہ کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

لالہ و گلزار ادبی اکیڈمی کے زیر اہتمام

استاد امین خیال، حاجی اقبال زخمی، خلیفہ سراج دین درویش، ڈاکٹر سجاد مرزا اور حاجی محمد اعجاز طاہر کے ایصال ثواب کے لیے ناصر باغ چوپال لاہور میں نعتیہ مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا۔ مشاعرے کی صدارت اقبال راہی اور پروفیسر ڈاکٹر یونس احقر نے کی۔ مہمانانِ خصوصی میں ناز اوکاڑوی، عمران سلیم، پروفیسر عاشق رحیل، پروفیسر ظہیر احمد ظہیر اور پروفیسر ڈاکٹر ارشد اقبال ارشد تھے۔ جن شعراء کرام نے سرکارِ دو عالم ﷺ کے حضور ہدیہ نعت پیش کیا ان میں عقیل شافی، ساجد پریمی، حافظ ظفر اقبال، شوکت علی شوکت، فرزند گرداس پوری، وحید ناز، بیراجی، خالد کلیار، وحید انصاری، خالد خورشید، اعظم توقیر، سید جاوید علی شاہ، سید فراست بخاری، ہمایوں پرویز شاہد، عدل منہاس لہوری، امجد اقبال امجد، انور اُداس، محمد اشرف، شاہد عباسی، اویس گلزار، بابا صلاح الدین شامل تھے۔ پروگرام کے دوران پروفیسر ڈاکٹر یونس احقر کی نعتیہ کتاب "حب حرماں دی" اور عمران سلیم کی نعتیہ کتاب "پتھراں دے وچ پھل کھڑے" کی رونمائی بھی کی گئی اور خلیفہ سراج دین درویش کی ادبی پگ عقیل شافی کے سر پر تمام سینئر شعراء کرام نے باندھی اور اُسے خلیفہ عقیل شافی کا نام دیا گیا۔

ادبی تنظیم "روپ سروپ" کے زیر اہتمام

رپورٹ (عقیل شافی) پچھلے دنوں رمضان المبارک میں پہلا "آن لائن موبائل" نعتیہ مشاعرہ ہوا۔ مشاعرے کا آغاز تلاوت کلام پاک سے کیا گیا۔ جن شاعروں نے سرکار دو عالم ﷺ کے حضور ہدیہ نعت پیش کیا ان میں عقیل شافی (لاہور)، صدیق سراج (دینہ)، شاہیر تہامی (ایبٹ آباد)، ڈاکٹر محمد خالد (اٹک)، امین عدرائی، عبیداللہ توقیری (وزیر آباد)، ریحانہ کنول (فیصل آباد)، شاہ روم خان ولی (کراچی)، امین بابر (رحیم یار خان)، ڈاکٹر کاشف علی شامل تھے۔

اکادمی ادبیات پاکستان (لاہور) میں قطر کے شعراء کے لیے مشاعرہ

اکادمی ادبیات پاکستان پنجاب کے لاہور دفتر اور ادارہ خیال وفن کے اشتراک سے محفل مشاعرہ منعقد ہوئی۔ قطر سے آئے ہوئے دو معروف شعراء فرتاش سید اور قیصر مسعود کے اعزاز میں منعقدہ اس مشاعرہ کی صدارت نامور شاعر شفیق سلیمی نے کی۔ مہمان اعزاز جاپان سے آئے ہوئے نوجوان شاعر عامر بن علی تھے۔ نظامت کے فرائض ادارہ خیال وفن کے صدر محمد ممتاز راشد نے کی۔ تلاوت کلام پاک اور نعت رسول کی سعادت ریاض احمد ریاض نے حاصل

کی۔ مشاعرہ میں جن شعرائے کرام اور شاعرات نے کلام سنایا ان میں شفیق سلیمی، فرتاش سید، قیصر مسعود، عامر بن علی، سعید الظفر صدیقی (کراچی)، اسلام عظمی، رشید نیاز (سیالکوٹ)، ریحانہ اشرف، عذرا مرزا، حسن عباسی، ناز بٹ، آفتاب خاں، سلمی افتخار، توقیر عباس (جھنگ)، حسن بانو، سہیل عباس، محمد خاور، ریاض احمد ریاض، ناظم مشاعرہ محمد ممتاز راشد اور دیگر شعرا شامل تھے۔

صدر مشاعرہ اور مہمان شعراء نے اس پذیرائی پر اکادمی ادبیات اور ادارہ خیال وفن کا شکریہ ادا کیا۔ اکادمی ادبیات پاکستان کے لاہور آفس کی طرف سے تمام شرکاء کا شکریہ ادا کیا گیا۔

تنویر ظہور کی کتاب ''علامہ اقبال تے پنجابیت'' شائع ہوگئی

معروف ادیب، شاعر اور کالم نگار تنویر ظہور کی 28 ویں کتاب ''علامہ اقبال تے پنجابیت'' شائع ہو گئی ہے۔ علامہ اقبال کی پنجابی زبان وادب سے لگاؤ کے حوالے سے یہ پہلی کتاب ہے جس کا اعتراف جسٹس (ر) ڈاکٹر جاوید اقبال نے فلیپ میں کیا ہے۔ کتاب میں تنویر ظہور کا تفصیلی مضمون ''علامہ اقبال نے بھاٹی دروازے وچ دن کیویں گزارے'' اور علامہ صاحب کی حقہ پیتے ہوئے نایاب تصویر بھی شائع کی گئی ہے۔ دیباچہ نگاروں میں ڈاکٹر سلیم اختر اور ڈاکٹر طاہر تونسوی شامل ہیں۔ کتاب منگوانے کے لیے رابطہ نمبر 0300-4426314

جواں مرگ شاعر ہمایوں شہزاد کا تعزیتی ریفرنس

پچھلے دنوں ''سخن آباد'' کے زیر اہتمام جواں مرگ شاعر ہمایوں شہزاد کا تعزیتی ریفرنس گنج شکر سپیشل ایجوکیشن کمپلیکس اوکاڑا میں انعقاد پذیر ہوا۔ ہمایوں شہزاد سے محبت رکھنے والے بے شمار احباب جن میں شعراء، ادباء اور دانشور شامل تھے اس تعزیتی تقریب کا حصہ بنے۔ تلاوت کلام خدا اور ثنائے مصطفیٰ کے بعد اس تقریب کا آغاز ہوا۔ ندیم اصغر جو ہمایوں کے بڑے بھائی بھی ہیں نے اس تقریب کی نقابت کی۔ ان کی گلوگیر آواز نے سامعین کو رلا دیا۔ جن احباب نے ہمایوں شہزاد کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے اس کی یادیں تازہ کیں اُن میں پروفیسر اکرم طاہر، ملک مقبول حسین شاکر، احمد جلیل، کرنل مظاہر الحق چشتی، احمد ساقی، سخنور نجمی، پروفیسر حامد علی، صابر رضوی، امین انجم، اقبال فریدی اور ندیم اصغر کے نام شامل ہیں۔

حلقہ فروغ نعت اوکاڑا کے زیر اہتمام نعتیہ نشست

پچھلے دنوں حلقہ فروغ نعت اوکاڑا کے زیر اہتمام اقرا ماڈل پبلک سکول میں ماہانہ نعتیہ نشست کا انعقاد ہوا۔ صدارت جاوید عارف نے کی جبکہ غلام نبی طاہر مہمان خصوصی تھے۔ نظامت کے فرائض احمد جلیل نے بطریق احسن نبھائے۔ محمد ابراہیم تبسم نے تلاوت کلام پاک سے اس پاکیزہ محفل کا آغاز کیا۔ ثناخوانی رسول کا شرف نعیم فریدی کے حصے میں آیا۔ جن شعرائے کرام اور ثنا خوان رسول نے مدحتِ رسول کے پھولوں کی مہکار سے محفل کو مشکبار کیا اُن میں جاوید عارف، احمد جلیل، پروفیسر امین انجم، غلام نبی طاہر، نعیم فریدی، سلیم انجم، ڈاکٹر عبدالستار شاہد اور عاکف عثمان کے نام شامل ہیں۔ شعراء اور نعت گویان رسول کے علاوہ کثیر تعداد میں باذوق عاشقان رسول نے بھی اس پاکیزہ محفل میں شرکت کی۔ جب محفل کا اختتام ہوا تو شرکاء میں افطاری کے لیے ڈنر بکس تقسیم کیے گئے۔ احمد جلیل کا یہ نعتیہ شعر حاصل نشست رہا۔

روشنی مصطفیٰ کا صدقہ ہے
ورنہ ظلمت کدہ جہاں ہوتا

گلشن ادب کا ماہانہ مشاعرہ

گلشن ادب کا ماہانہ مشاعرہ حسب معمول پروفیسر عاشق رحیل کی رہائش گاہ پر ہوا۔ صدارت جناب راشد حسن رانا کی تھی اور مہمانان خصوصی ممتاز راشد، مختار جاوید اور راجا نیئر صاحبان تھے۔ ان شعرائے کرام نے اپنا اپنا کلام سنایا۔

پروفیسر حسن عسکری کاظمی، پروفیسر عباس مرزا، اقبال راہی، پروفیسر عاشق رحیل، عدل منہاس لاہوری، عاصم خواجہ، طارق چغتائی، فراست بخاری، حکیم سلیم اختر ملک، نجمہ شاہین، ساجد نسیم بٹ، ہمایوں پروفیسر شاہد، حاجی محمد لطیف، وحید ناز، شاہد عباسی، خواجہ ذاکر، محمد امین ایمی، سلیم صابر، سعید الفت، آغا ارشد، رانا اظہر فیروز، صابر چوہدری، عقیل شافی، رانا محمد اکرم۔

مشاعرے کے آخر میں بزم چغتائی کے بانی جناب طارق چغتائی کی سالگرہ کا کیک کاٹا گیا۔

نصیر احمر کے حمدیہ شعری مجموعہ ''تیرے نشان شام وسحر'' کی تقریب رونمائی

فعال ادبی و فلاحی تنظیم ''نگہبان ویلفیئر فاؤنڈیشن ساہیوال'' کے زیر اہتمام معروف شاعر جناب نصیر احمر کے حمدیہ شعری مجموعہ ''تیرے نشان شام وسحر'' کی تقریب رونمائی مقامی ہال میں منعقد ہوئی جس کی صدارت صوبائی وزیر برائے زکوٰۃ وعشر، فخر ساہیوال اور رکن صوبائی اسمبلی جناب ملک ندیم کامران نے کی۔ جبکہ نوجوان کالم کار اور دانشور جناب میاں بابر صغیر (صدر ہیومن رائٹس ساہیوال ڈویژن) مہمان خصوصی تھے۔ مہمان اعزاز میں جناب عابد کمالوی (لاہور) جناب عارف منصور (لاہور) جناب محمد امین ساجد سعیدی (حاصل پور) اور جناب رہبر صمدانی (ملتان) شامل ہیں۔ جناب نصیر احمر کے فن و شخصیت پر جن معروف شعراء و ادباء نے اپنے مضامین پیش کیے ان میں پروفیسر سید محمد اکبر، جناب طالب جتوئی، پروفیسر محمد افتخار شفیع (پی۔ ایچ۔ ڈی سکالر) اور جناب پروفیسر ارجمند احمد قریشی کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔

تبصرۂ کتب/فلیپ/آراء

نام کتاب: نئی صدی نئی نعت (اکیسویں صدی کی پہلی دہائی میں اُردو نعت) /مصنف: خورشید ربانی/صفحات 336 /تبصرہ نگار: علی رضا

پبلشر: مکتبہ B.P.H پرنٹرز، لاہور

خورشید ربانی کا نام شعروادب کی تخلیق اور تصنیف و تالیف کے کام کے حوالے سے کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ ان کا کلام طویل عرصے سے صفحۂ اوّل کے جرائد و رسائل میں شائع ہو رہا ہے۔ عرصہ ۱۲ سال سے نوائے وقت اسلام آباد سے وابستہ ہیں اور آج کل سب ایڈیٹر نیوز کے طور پر اپنی ذمہ داریاں سرانجام دے رہے ہیں۔ نظم و نثر پر مشتمل کئی کتابیں اب تک شائع ہو چکی ہیں۔ جن میں رخت خواب، کفِ ملال (شاعری)، حسرت موہانی (فن و شخصیت)، آدھی ملاقات (خطوط احمد ندیم قاسمی) و دیگر شامل ہیں۔

نئی صدی، نئی نعت کے نام سے مرتب کی ہوئی ان کی کتاب شائع ہوئی ہے۔ آغاز میں مقدمہ خورشید ربانی نے تحریر کیا ہے جس میں انہوں نے نعت گوئی کی تخلیقی تحریر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے والے سینئر اور جونیئر شعراء کا نہ صرف تفصیل سے ذکر کیا ہے بلکہ ان کے نعتیہ اشعار کا حوالہ بھی دیا ہے۔ اس کتاب میں عصر حاضر کے دو سو انیس سینئر اور نئی نسل سے تعلق رکھنے والے نامور شعراء کی نعتیں بھی شامل کی گئی ہیں۔ جن میں آصف ثاقب، ابوالخیر کشفی، احمد ندیم قاسمی، ادیب رائے پوری، افتخار عارف، امجد اسلام امجد، امین راحت چغتائی، توصیف تبسم، حسن عباسی، حفیظ تائب، خورشید رضوی، راغب مراد آبادی، سلیم کوثر، سید نصیر الدین نصیر، شوکت ہاشمی، عاصی کرنالی، محمد اظہار الحق، منیر سیفی (کتاب میں شعراء کے اسمائے گرامی حروف تہجی کے اعتبار سے دیے گئے ہیں) منیر سیفی سمیت بہت سے شعراء کا کلام شامل ہے۔ خورشید ربانی نے اس اہم اور مشکل کام کو جس خوش اسلوبی اور محنت سے پایۂ تکمیل تک پہنچایا ہے وہ انہی کا حصہ ہے۔ نعت پر کام کرنے والوں کے لیے یہ کتاب حوالے کے طور پر کام آئے گی اور بہت مفید ثابت ہوگی۔ اس کتاب کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس عہد میں لکھی جانے والی نعت بھی والہانہ پن، وارفتگی اور آشفتگی میں جملہ خصوصیات سے ہم آہنگ ہو کر اپنے دور کے فنی اور تخلیقی تقاضوں کو پورا کرتی دکھائی دیتی ہے۔

شاعر: فہیم ضیاء/صفحات 128 /تبصرہ نگار: عامر بن علی

فہیم ضیاء کی غزلیہ شاعری نے پچھلی ایک دہائی سے مجھے اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔ وہ اپنے ہم عصر نوجوان شعراء میں کئی پہلوؤں سے منفرد ہے۔ اُس کی یہ انفرادیت اُس کی بے پناہ تخلیقی صلاحیتوں اور دو دہائیوں کی طویل اور مسلسل ریاضت کی بدولت قائم ہوئی ہے۔ وہ منفرد اور مشکل زمینوں میں شعر کہنے کا ہنر اور سلیقہ جانتا ہے۔ وہ لفظوں کی نشست و برخاست اور مترنم بحور کے استعمال میں کمال دسترس رکھتا ہے۔ فہیم ضیاء کی غزلیہ شاعری میں جہاں ہجر و وصال کی کیفیات سموئی ہوئی ہیں وہاں عصری موضوعات بھی اپنی پوری توانائی کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ فہیم ضیاء اپنی تخلیقی صلاحیتوں کی بدولت بیک وقت کئی صنف ادب کی طبع آزمائی کرتا ہے۔ اس کا ہنر تمام صنف ادب میں یکساں کارگر ہے۔ وہ محفل میں سوز و گداز میں گوندھی ہوئی غزل سنا کر داد وصول کرتا ہے، تو کبھی مزاحیہ قطعات

پیش کر کے اپنی شوخیِ طبع کا لوہا منواتا ہے۔ اس کی کہی ہوئی نعتیں کبھی سامعین کو سرشار کرتی ہیں تو کبھی اس کی نثر کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ مجھے فخر ہے کہ ایک سچا تخلیق کار میرے حلقۂ یاراں میں شامل ہے۔ میں دل سے اس کی قدر کرتا ہوں اور دعا گو ہوں کہ خدا فہیم ضیاء کے کلام میں مزید توانائی عطا فرمائے۔ ذیل میں چند اشعار پیش کر رہا ہوں جو مجھے بے حد پسند ہیں۔

دھوئیں کی زد میں بہت سوگوار بیٹھا ہے
چراغ بھول گیا تھا ہوا کسی کی نہیں

تب شعروں میں جذبے جا کر ڈھلتے ہیں
پہلے دل میں آگ لگانی پڑتی ہے

دل میں جھانکو تو نظر ارض و سماء آتے ہیں
شیشۂ دل مری حیرت کے لیے کافی ہے

بے خودی کے عالم میں آنکھ بھر کے رونا تھا
پہلی بار بچھڑے ہیں اس طرح تو ہونا تھا

شعورِ عصر/شاعر: قیصر خالدؔ/صفحات 152/تبصرہ نگار: اظہر شکیل نگینوی

ناشر: عالمی میڈیا پرائیوٹ لمیٹڈ (نئی دلی)

قیصر خالدؔ کا تعلق اس ادبی اور علمی قبیلے سے ہے کہ جس کے نزدیک علم کا سیکھنا اور سکھانا ہی مقصدِ حیات ہے۔ قیصر خالد نے بھی ابتدائی درجات سے ہی وسیع تر کسبِ علم کو اپنا شعار بنا لیا تھا۔ نتیجتاً درجہ اول سے ہی امتیازی کامرانی کے ساتھ حصولِ علم کی منازل طے ہونے لگیں اور پھر ۱۹۹۷ء میں سول سروس کے اعلیٰ مقابلہ جاتی امتحان میں منتخب روزگار ہو کر انڈین پولیس سروس میں فائز کیے گئے۔ ایک بیدار مغز، حساس دل اور فکر انگیز ذہن رکھنے والی اس شخصیت نے اپنی زندگی کے مشاہدوں، تجربات و احساسات بیان کرنے کے لیے شاعری کو ذریعہ بنایا۔ ملازمت بھی وہ پائی جس میں انسانی افکار و احساسات، جذبات، کیفیات اور حالات کا قریب سے جائزہ لینے کا موقع فراہم ہوا۔ خود کسبِ تعلیم، کسبِ معاش اور دیگر وقتی ضروریات کے تحت ہجرت و بے وطنی اور اقدار کی کشمکش جیسے مشاہدات سے دوچار ہوئے اور ان ہی حالات کے باعث زندگی کے تنوع کے بھرپور جائزے کا موقع ملا۔ شادی بھی ایک ایسے خانوادے میں ہوئی کہ جو کتب عظیم آباد کے بانیان میں سے تھے۔ ان کی اہلیہ مشہور شاعر جناب سید محمد علی شاد عظیم آبادی کی پڑپوتی ہیں۔ خسر مرحوم پروفیسر آل احمد انجم فاطمی جو کہ بذاتِ خود کئی کتابوں کے مصنف بھی تھے، کے ساتھ لمبے عرصے تک رہنے کا موقع نصیب ہوا۔ جن کی رہنمائی میں ادبی ذوق اور شاعری کے شعور کو مزید جلا ملی۔ پہلے تالیف کا کام کیا، دیوانِ شاد عظیم آبادی کو مرتب کر کے شائع کروایا۔ پھر یہ سلسلہ آگے چلتا گیا اور اب ان کا خود کا مجموعۂ کلام آپ کی نذر ہے۔ فی الوقت وہ ایڈیشنل کمشنر آف پولیس کے عہدے پر شہر ممبئی میں اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

مجھے پھر سے سنبھلنا ہے/شاعر: پروفیسر محمد احسن رضا بھٹی/صفحات 167/تبصرہ نگار: عقیل شافی

ناشر: ہجر فقیر پنجابی ادبی سنگت، معصوم شاہ روڈ بادامی باغ، لاہور

احسن رضا کی پہلی کتاب ''بیتی یادوں کا موسم'' ادب کے پرستاروں سے بے پناہ داد وصول کر چکی ہے۔ ان کی شاعری میں خیالات کی انفرادیت، موضوعات کی تازہ کاری، جذبوں کی رمق، احساس کی شفق دکھائی دیتی ہے اور ان کے شعروں میں ضمیر کے توڑ پھوڑ کی کھنک اور حالات و واقعات کے اونچ نیچ

کی گونج صاف سنائی دیتی ہے۔ حمد، نعت، نظم، غزل، رباعی، قطعہ میں پر مغز مضمون۔ لفظوں کی شائستگی، خوبصورت قافیے، ردیف اور استعارے کا استعمال اتنے کمال سے کیا گیا ہے کہ قاری کو کسی بھی کلام میں عروض کی کمی محسوس نہیں ہوتی۔ شاعری کا یہ ہنر اچھے اساتذہ کا کلام مطالعہ کرنے سے ہی حاصل ہوتا ہے۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ اگر احسن رضا اس طرح خوبصورت شعر کہتے رہے تو وہ دن دور نہیں جب ان کا نام ادب کے آسمان پر روشن ستارے کی مانند چمکتا دکھائی دے گا۔ میں مبارک باد پیش کرتا ہوں رضا کو جنہوں نے اُردو میں ''مجھے پھر سے سنبھلنا ہے'' کے نام سے ایک خوبصورت کتاب ادب کے قارئین کو دان کی ہے۔ میری دعا ہے احسن رضا کو ادب میں وہ مقام حاصل ہو جس کے وہ حقدار ہیں۔ ''اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ''

اک شہر بسا پانی پر/ شاعرہ: شبانہ زیدی/ صفحات 172/ تبصرہ نگار: احتشام جمیل شامی

ناشر: الاشراق پبلی کیشنز، ۶ نور چیمبرز، گنپت روڈ، لاہور

سیدہ شبانہ زیدی کا تعلق ادب کی زرخیز سرزمین جس نے ظفر اقبال، اسلم کولسری اور مسعود احمد جیسے سپوت پیدا کیے) اوکاڑا سے ہے۔ پیشہ کے لحاظ سے اُستاد ہیں۔ ۲ کتابوں کی مصنفہ ہیں ''سلگتے کنول''، ''اک شہر بسا پانی پر''۔ لاتعداد مشاعرے پڑھ چکی ہیں۔ ادبی دنیا میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔ ان کی کتابوں پر پاکستان کے علاوہ بیرونِ ملک سے بھی شعراء کرام نے تبصرے کیے ہیں۔ پاکستان کی مشہور ادبی تنظیم روش انٹرنیشنل کی اوکاڑا میں سینئر نائب صدر ہیں اور پاکستان کے تمام بڑے شہروں میں ان کی کتابوں کی پذیرائی کے سلسلہ میں پروگرامز منعقد ہو چکے ہیں۔ ان کی شاعری ہر دور کی شاعری ہے۔ اس میں درد و کرب بھی ہے، غم و ہجر بھی، ملن اور جدائی بھی، یاس اور اُمید بھی، غزل کے ساتھ ساتھ بڑی خوبصورت نظم بھی کہتی ہیں۔ شبانہ زیدی کی شاعری کا مطالعہ بتاتا ہے کہ انہوں نے اس رمز کو پالیا ہے کہ کون سی بات کہنی ہے، کون سی ان کہی رکھنی ہے۔ وہ روایت کے دائرے میں رہتے ہوئے جدیدحسیت کو برتنے کا سلیقہ جانتی ہیں۔ وہ پھولوں، تتلیوں، خوشبو اور رب اکبر کی قدرت سے پیار کرنے والی شبین، لطیف احساسات، سچے جذبات، محبتوں، روایات، مشاہدات و خیالات کا اک شہر آباد دیکھتی ہے۔ اپنائیت، پاکیزگی نفس اور واحدانیت ہو۔ میری نیک تمناؤں اور بھرپور دعائیں ہر لحہ شبانہ زیدی کے ساتھ ہیں۔ اللہ پاک ان کی تخلیق خود اعتمادی کو قائم رکھے اور وہ اپنے قلم، خیالات اور مثبت سوچ سے اس بے ڈھنگ معاشرہ کو بدلنے میں ہمیشہ اہم کردار ادا کرتی رہیں۔ آمین اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

ستارے تاکتے رہنا/ شاعر: میاں محمد مرغوب/ صفحات 228/ تبصرہ نگار: عطاء الرحمٰن قاضی

رابطہ: فیض آباد، کربلا روڈ، ساہیوال

جناب میاں محمد مرغوب کی غزل قاری کے لیے ایک خوش کن تجربہ ان معنوں میں ہے کہ اس میں انبساط و غم کا متوازن روپ دیکھنے کو ملتا ہے۔ کلاسیکی غزل کے علائم و رموز سے شناسائی نے ان کی غزل میں ایک تہذیبی وقار پیدا کر دیا ہے۔ مابعد الطبیعیات کے بجائے مابعد الطبیعیات سے جنم لینے والی اخلاقیات ان کی غزل کا بنیادی حوالہ ہے۔ طنز ان کا وہ فنی حربہ ہے جس نے ان کی غزل کے اخلاقی پہلو کو خوب نمایاں کیا ہے۔ ان کا طنز اکبر کی یاد ضرور دلاتا ہے۔ مگر اکبر کے طنز کی شدت میاں مرغوب صاحب کے ہاں نہیں ملتی۔ انہوں نے جانوروں اور مختلف پرندوں کو علامتی انداز میں پیش کر کے جدید طرز معاشرت کے کھوکھلے پن کی طرف لطیف اشارے کیے ہیں۔ تلمیحات اور محاوروں کا برمحل اور فنکارانہ استعمال زبان و بیان سے ان کی گہری وابستگی کا ثبوت فراہم کر رہا ہے۔

نام کتاب: جانِ محسن/شاعرہ: وشمہ خان وشمہ/صفحات 106/تبصرہ نگار: منیر احمد

رابطہ: انتظام گروپ آف پبلی کیشنز، کراچی

وشمہ خاں وشمہ کا پہلا شعری مجموعہ ''سرگوشیاں'' ادبی حلقوں میں پذیرائی حاصل کر چکا ہے۔ ''جانِ محسن'' کے نام سے منظرِ عام پر آنے والی ان کی دوسری کتاب یقینی طور پر ایک عمدہ کاوش ہے۔ اس کتاب میں موجود کچھ کلام تو ایسا ہے جسے دیکھ کر لگتا ہے جیسے یہ اساتذہ کی شاعری ہو اور ایسا کیوں نہ ہو کیونکہ محترمہ بہت عجز و انکساری سے نامور شعراء سے اصلاح حاصل کر رہی ہیں۔

مجھے اُمید ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ وشمہ خاں وشمہ کی شاعری میں مزید نکھار آئے گا اور ہمیں ان کا کلام پڑھنے کو ملتا رہے گا۔

نام کتاب: برگِ نوخیز/شاعر: علی آصف/صفحات 164/تبصرہ نگار: اصغر علی جاوید

ناشر: فرح پبلی کیشنز، شیخوپورہ

چھ ارب سے زائد انسانوں کے اس جھرمٹ میں ہر شخص خوفناک تنہائی کا شکار ہے۔ تنہائی اور اُداسی کے اس کرب کا اظہار جب کوئی شاعر، ادیب یا مصور کرتا ہے تو وہ فن پارے کی صورت میں منتقل ہوتا ہے۔

علی آصف انگریزی ادبیات میں ایم اے ہے اور انگریزی کی تدریس کو ہی ذریعہ معاش بنا رکھا ہے لیکن شاعری کے لیے اس نے اردو کا انتخاب کیا ہے۔ اس نوجوان شاعر نے اپنے اضطراری جذبات کا اظہار کس طرح کیا ہے اور کیسے فن پارے تخلیق کیے ہیں اوراق پلٹیے اور دیکھیے۔ اس طرح کے بے شمار خوبصورت اشعار آپ کو اس نرم دل اور وجدان پسند نوجوان شاعر کا گرویدہ بنا دیں گے۔

نام کتاب: راج نگر/مصنف: عزیر الطاف/صفحات 96/تبصرہ نگار: اختر شمار

ناشر: یاسر عمیر پرنٹرز

عزیر الطاف نئے لکھنے والوں میں ایک ایسا کہانی کار ہے جس کے ہاں اپنی عمر سے زیادہ گہرا مشاہدہ اور تخلیقی جوہر نمایاں ہے۔ اس کی کہانی ہمارے آج کے اس تیز رفتار معاشرے کے رنگوں کی عکاس ہے جس میں دکھ درد محرومیاں اور ناانصافیاں جا بجا بکھری دکھائی دیتی ہیں۔ عزیر کی جو کہانیاں میری نظر سے گزری ہیں ان میں اس نے محض چونکانے کی کوشش نہیں کی بلکہ جو کچھ دیکھا محسوس کیا، اسے صفحہ قرطاس پر اُتار دیا ہے۔ اس کی کہانیوں سے محسوس ہوا ہے کہ وہ کہیں کہیں سماج کی ناہمواریوں پر کڑھتا ہے اور میں سمجھتا ہوں معاشرے کی بے ترتیبی پر ایسی کیفیت ایک سچے تخلیق کار کی اولین نشانی ہوا کرتی ہے۔

اس کی کہانیوں کے کرداروں میں زندگی کے متنازع رنگ دیکھے جا سکتے ہیں۔ وہ ایک ایسا تخلیق کار ہے جس میں زندگی کو کہانی بنانے کی خواہش معصومیت اور سادگی سے پروان چڑھتی دکھائی دیتی ہے۔

نام کتاب: ڈوڈو یاردل/شاعر: کرم علی کیفی/صفحات 160 /تبصرہ نگار: محمد شریف ساجد

ناشر: اکبر لاہوری فاؤنڈیشن ای 14 / 16 فاروق کالونی، والٹن روڈ، لاہور کینٹ

کیفی صاحب کی شاعری نئے توانا جذبوں کی شاعری ہے جو ایک طرف روایت سے منسلک ہے اور دوسری طرف نئی سوچ کے زاویے فراہم کرتی ہے۔ ان کی تمنا حسرت نہیں بنتی بلکہ اُمید کے سانچے میں ڈھلتی ہے۔ یہ بھوک بیماری، گریہ زاری اور دست ستم کو مفلس کے گھر کا مہمان تو بتاتے ہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ مہمانوں کو ایک نہ ایک دن تو رخصت ہونا ہی ہوتا ہے اور ظلم کی طویل رات کو ختم ہونا ہے۔ کیفی صاحب کی شاعری میں گداز سے زیادہ اضطراب ہے جو اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ وہ منزل سے آشنا ہیں اس لیے وہ شانتی اور سکون بھی ہے جو منزل کی طرف گامزن مسافر کے ہاں پائی جاتی ہے۔ گم کردہ راہ کے ہاں نہیں۔ کیفی صاحب ایک اضطرابی شاعر ہیں جو کہ زمانے کے دکھ درد سمیٹ لینے کے لیے بے قرار ہیں۔ مشق سخن میں کیفی صاحب نے بات کو آگے بڑھایا ہے اور نئے تجربات کیے ہیں۔ ان کا کلام اردگرد کے ایکسرے پر مشتمل ہے۔ ان میں ان کا شدت احساس موجود ہے۔ کیفی صاحب نے عوام کی آسوں، اُمیدوں، پیاسوں، مایوسیوں اور ٹوٹی بکھرتی اُمنگوں کا زیادہ قریب سے مشاہدہ کیا ہے اور اپنے مشاہدے کو غزلوں، نظموں میں بیان کر دیا ہے۔ ان کا اسلوب منفرد اور عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہے۔

نام کتاب: حب حرماں دی/مصنف: پروفیسر ڈاکٹر یونس احقر/صفحات 128 /تبصرہ نگار: حسن عباسی

پبلشر: ادارہ پنجابی لکھاریاں شاہدرہ، لاہور

پنجابی ادب چ غزل دی گل جدوں وی چھڑے گی تے یونس احقر ہوراں بنا گل اگانہہ نہیں ٹرے گی۔ تاں جے اوہناں غزل نوں شنگھارن لئی گہنے لیڑے لتے پا کے کسے ووہٹی وانگ لشکا ڈشکا کے غزل بیچ دے جا بٹھایا۔ یونس احقر ہوراں دی غزل اردو دی غزل توں کتے گھٹ نہیں۔ احقر ہوراں غزل چ ناں بنان توں بعد اپنے تخلص ''احقر'' دا بڑا اُبھرواں رکھ رکھا رکھیا۔ اج ''حب حرماں دی'' دیاں نعتاں پڑھ کے اندازہ ہویا تے مناوی پیا کہ استاد استاد ہوندے نیں۔ اوہناں نعت اوس کیفیت وچ لکھی جیویں اوتھے آپ ہون یا حاضری دے آئے ہون۔ ایہہ کم یا اپنے جذبات دا اظہار تے کوئی عاشق ای کر سکدا اے۔ تے اوہ وی عاشق رسول۔ احقر ہوراں دیاں دلی جذبات تے کیفیات نال بھرپور نعتاں پڑھ کے سواد آوندا اے تے دل کردا اسیں وی اوہ تھاں ویکھئے جنوں دنیا تے ایہہ اللہ پاک خود آپ ویکھن دا خواہشمند اے۔ احقر ہوراں حمداں، نعتاں دی اوسے حب نال لکھیاں جیہڑی نعت وچ اے۔ تاں ای اوہناں مجموعہ داناں وی ''حب حرماں'' ای رکھیا اے۔ میری دعا اے اللہ پاک تے اوہناں دے نبیؐ احقر ہوراں دی حب قبول کر دیا ہویاں اوہناں دی عزت چ وادھا کرے میں احقر ہوراں نوں دلی مبارک دیناواں۔

گوشہ نعت

ڈاکٹر محمد یونس احقر

ہسکدیاں اکھاں، سڑے سینے نوں ٹھاراں کس طرحاں
گزردا نہیں پل پیا عمراں گزاراں کس طرحاں
ذہن خوشبوواں توں خالی اے، زباں غرضاں بھری
رب دے محبوبا! میں دس تینوں پکاراں کس طرحاں
نوں نہیں اونے مرے جُثے تے جنے داغ نیں
کس طرحاں اُڈّاں میں کھمباں نوں کھلاراں کس طرحاں
بے دلی میری دے لئی چھلاں وی ہن طوفان نیں
میں سفینے نوں کنارے توں اُتاراں کس طرحاں
میرے اپنے کن مری فریاد نوں سُن دے نہیں
میں سہارے لئی کسے نوں واج ماراں کس طرحاں
ہن تے بس تیرے اُچیّ آسرے دی لوڑ اے
رُڑھدیاں شیواں دے ول باہواں اُلاراں کس طرحاں
سب دیاں بختاں دیاں تنداں سنوارن والیا
مینوں دس وگڑی ہوئی تانی سنواراں کس طرحاں
اشرف المخلوق ہو کے وی میں احقر بن گیاں
بادیاً ہن ہور میں ہاراں تے ہاراں کس طرحاں

کلیاں کھلیاں، پھُل مسکائے
جگ دے محسنؐ جگ تے آئے
نیویاں تکیا اُچیا ہو ہو
اُچیاں اوہوں سیس نوائے
قوس قزاواں راہواں ملیاں
چن ستاریاں نین وچھائے
مست ہواواں پکھے جھلّے
بدلاں جھک جھک کیتے سائے

صحراواں دے سینے مہکے
ندیاں گیت خوشی دے گائے
پُت جھڑاں سامان سمیٹے
آن بہاراں ڈیرے لائے
نھیریاں دا ہر رُوپ گواچا
چانن سبھ پاسے رُشنائے
شگن منائے اک اک شے نے
ہر ذی روح نے جشن منائے
دشمنیاں تے نفرت مکی
جھنڈے اُلفت نے لہرائے
رُتاں پھریاں، موسم بدلے
مُکّے کوجھ، سکھاں آئے
بُت پرستی دے دن پُگے
حق پرستی دے دن آئے
سوہنے دے سوہنے دیاں گلاں
سودھی سوچ عمل اُچیائے
کُھل کے اساناں دا لاڑا
رب دھرتی دے مان ودھائے
مغروراں دیاں دھوناں لفیاں
ماڑے احقر گلے وڈیائے

پل پل بے وس کردا جاوے دنیا دا ورتارا
تیریاں یاداں ورشہ آقا! تیری سانجھ سہارا
تیرے باجھوں گھمن گھیراں وانگوں گگن
تیرا رہوے کرم تے جاپے گھمن گھیر کنارا

بشریت دے روپ وچ دھرتی اُتے آون توں پہلاں
شیشہ نور ترے دا امبروں دیندا سی لشکارا
توں اوہناں نوں دوسریاں دے دُکھ ونڈانے دسے
جہناں نوں سی جگ تے اِکو اپنا آپ پیارا
تیرے سچ دی لاٹ ولاں وچ ایسا چانن کیتا
بتاں نوں کر دتا بت پرستاں پارا پارا
حشر دیہاڑے ساڈے کوجھے عملاں ول نہ ویکھیں
بخشن ہار دیا محبوبا! اُمت دے غم خوارا!
خالی صدقوں نیں احقر دیاں جیکر ایہہ فریاداں
اپنے کرموں قائم رکھیں ساڈا بھرم بچارا

کائنات وچ اک مثال نگینے دی
مکے دی عظمت تے شان مدینے دی
کنڈھے لاون دے لئی ڈُب ڈُب جاندیاں نوں
رحمت بن کے آئی شکل سفینے دی
اپنا اپنا چہرہ، اپنا اپنا رُوپ
ہر اک نوں دکھلایا شکل آئینے دی
آخر اوہنوں سودھن دے لئی آپ آئے
جس عالم نوں لوڑ سی نویں قرینے دی
اوہدے سخنے، اوہدیاں یاداں اوہدا پیار
اکھیاں دے لئی ٹھنڈ تے راحت سینے دی
جگ دیاں سب کستوریاں تے خوشبوواں توں
ودھیا، وکھری، وافر مہک پسینے دی
احقر ایہہ جگ واری اوہدے جوڑیاں توں
جس دے خلق مکائی چودھر کینے دی

شیشے تے کھڑ دے پُھلاں دی واشنا

نازاوکاڑوی

اجو کے سماج وڈ وچ بہت ساری پنجابی کوتا مانوی سروکاراں توں اگیج رو کے لکھی جا رہی اے پر کینیڈا دے وسنیک سرندر سوہل دا ناں ایجیے غیر ذمہ دار شاعراں وچ نہیں آوندا۔

تن دیپ تمنا ہوراں دی راہیں حسن عباسی ولوں جدوں ایہہ غزل سنگریہہ میرے تائیں پُجیا تے منہ مہاندرے نے پہلی جھج پائی۔ انہاں پھلاں چ لگے ہوئے دو پیار کرن والیاں دے پرچھانویں پھلاں دی واشناں نال اپنے نال جپی، بڑ ریتی سناندے دی نظر آوندے نیں۔ ایتھے حسن عباسی ہوراں دا ذوق تے شوق وی نکھر تے نکھر دا نظریں آوندا اے۔ جی گل ہو رہی سی بھرا سرندر سوہل ہوراں دی۔ سرندر ہوراں 2014ء وچ چیتنا بھرپور غزلاں دا سنگریہہ پرکاشت کر کے ایہہ سیدھ کردتا اے پئی اوہ اک چیتن پنجابی شاعر نیں۔ اس غزل سنگریہہ وچ اوس نے ساجک، سمھیا چارک، راج نیتک قدراں قیمتاں نوں بڑی ہی بلند آواج وچ رنگا ریا اے۔ ساہتک رچنا کردیاں سوہل ایس گل ولوں وی چیتن رہندے نیں کہ سکھ گروواں ولوں ورتائیاں گیاں زندگی دیاں اُچیاں سچیاں مانو قدراں قیمتاں اوس دی ہمیشہ اگوائی کر دیاں رہن۔ سرندر ہوراں اپنی پستک ایس کاوِ پستک وچ ساجک/ راج نیتک/ دھار مک وشیاں نوں اُچیچے ڈھنگ نال پیش کیتا اے۔ سرندر سوہل ہوراں بارے ڈاکٹر کوثر محمود تے تن دیپ تمنا نے وی اپنے سچا موجب بچ کے سلاہیا اے۔ میں وی سوہل ہوراں دی شاعری بارے کجھ ویروا کرنا چاہاں گا۔ پینڈی نے پہلی غزل دا پہلا ای شعر من کھچواں تے دل نوں کھوہ پان والا ای ملیا۔

وچھے سڑ دے نوں جدوں اج چھاں ملی میں رو پیا
بعد مدت دے سی مینوں ماں ملی، میں رو پیا

جنہاں دیاں ماواں جیوندیاں نیں رب اوہناں نوں حیاتی تے جنہاں دیاں سورگ باس ہو چکیاں نیں اوہ سرگ مانن۔ رب نے ماں دا رشتہ وی نویکلا تے انملا بنایا اے۔ مڈھ توں ای ماں جی دے بارے لکھیا جا رہیا اے۔ ہر ایک دا انداز اپنا اے۔ سرندر سوہل ہوراں دے اس شعر چ ویکھو کناں درد سمیٹیا نظر آ رہیا اے۔ ہوناں تاں ایہہ چاہی دا سی پئی سڑن توں بعد چھاں ملی تے بندہ خوشی دا اظہار کردا۔ پر نال ای مدتاں دی وچھڑی ماں دے ملاپ ہون نال رو پیا۔ کتے خوبصورت ڈھنگ نال چھاں ملن دی خوشی ماں دے وچھڑن بعد ملن دی خوشی روح اکھاں چوں ہنجو کرن لگ پئے۔ ایہہ تے پہلا شعر اے جیوں جیوں اگے ٹردے جایئے تے اک توں اک ودھ کے پُھل کھڑ دا نظر آوندا اے۔ تے کتے سرندر دے دل دے اُبال دی نظر آوندے نیں ایہہ شعر ویکھو:

مچھلیاں پھڑ دا میں تھک کے سوں گیا کہ خواب آیا
کڑھ رہیا ہے تیل، اس وچ مچھلی مینوں تل رہی اے

شعر وچ لفظاں دی ورتوں وی ویکھو شعر دی بناوٹ آپ دی سوچ تے فکر ول وی گوہ کرو۔ دوسرے مصرعے وچ ویکھو عام حالت نوں کنج پلٹا کے بیان کیتا گیا ہے۔ مچھلی پھڑن والا تے آپ مچھلی راہن یاں تکن لئی ای پھڑ دا اے ایتھے خواب وچ اپنے آپ نوں مچھی ہتھوں تلدا ویکھ رہیا اے۔ دراصل بندے دے اپنے اندر کئی پرتاں ہوندیاں نیں۔ تے بندہ آپ ای جان دا ہوندا اے۔ سے سرندر سوہل وی اپنے اندر دی کسے پرت وچ اپنے آپ اجیہی شکل وچ ویکھ رہیا اے تے اوہو سانوں دس رہیا اے۔ کجھ دانشوراں، گوروآں، صوفیاں، سادھواں، سنتاں دا آکھنا اے پئی شاعری پیغمبری پیشہ اے تے نالے شاعر حد نالوں زیادہ سوہل، نرول تے حساس ہوندا اے۔ تاہیوں اوہ ہلکی جئی سٹ نوں وی نہیں جر سکدا تے کلبلا اٹھدا اے۔ جتھیں تے کجھ کر نہیں سکدا اے قلم راہیں اپنا ساز بھوک کتے لکھ کے تے کتے گا کے کڈھ لیندا اے۔

میں چاہوندا ہاں میری ہستی اویں کوتا چ ڈھل جاوے
ہوا دُمچھلی جوں لنگھ کے جس طرحاں سروچ بدل جاوے

اس شعر ول دھیان دیو تے پتا چلدا اے کہ شاعر کناں کو حساس اے۔ شاعر تے اوہ ہے آپ تے خواہش کیہہ رکھدا اے۔ میرا وجود میری شاعری چ انج ڈھل جاوے جیکر ہوا دُمچھلی چوں لنگھدی ہوئی سراں وچ تبدیل ہو جاندی اے۔ ایہہ سر سُنن والیاں دے دلاں توں چھیڑ دی تے من بھاندی اے۔ ویکھو شاعر دُمچھلی نہیں دُمچھلی چوں گزر دیاں ہویاں آپ کجھ کرن دی گل کر رہیا اے۔ دُمچھلی آپ تے کجھ نہیں نہ۔ دُمچھلی چ ہوا نہ آوے تے اپنے آپ تے

وجنوں رہی۔ ایہو کمال اے سریندر ہوراں دا کہ اوہ آپ ایسی ہوا بننا چاہندے نیں جیہڑی وگجھلی نوں ہلا کے رکھ دیوے۔ سُر بننا چاہندے نیں تاں جے دنیا ج امن تے چین دے گیت سنے تے گائے جان۔ ایہہ دنیا نرگ توں سُرگ بن جائے۔

نری بندوق توں بچ کے پرندہ اُڈ تاں چلیا ہے
ایہہ چِنتا ہے کتے اُس نوں نہ ہن امبر نگل جاوے

اتھے وی سرندر ہوراں دی چِنتا ویکھو۔ پرندہ بڑا نازک جنور ہوندا اے۔ شکاری ہر ویلے مگر لگے رہندے نیں۔ اس منظر وچ سرندر ہوراں دی چِنتا دس پئی مینوں جاپے وی چِنتا اے پئی بندوق دے نشانیوں ڈریا ہویا پنچھی کتے اُڈدا اُڈدا ایناں اُچا نہ جائے کہ اگے امبر اونہوں اپنے منہ وچ نہ دبوچ لئے۔ گل کے ہور جنور دی ہوندی تاں ہور گل سی۔ گل اے پرندے دی جو نازک تے سوہل جنور اے۔ اوہدی اس کمزوری تے ترس وی کھا رہیا اے تے چِنتا وی جی نوں لائی بیٹھا اے۔

اساں پہلاں ای گل کیتی آ ناں پئی شاعر چارے پاسے نظراں رکھن والا نکی وڈی گل نوں سن دا تے سُردار ہندا اے۔ ہن ایہلے شعر ول ذرا گور کرو۔ اک تے انصاف اُتوں انھا، اتھے شاعر اکھیں ویکھ کے مکھی نگل کھا لئے۔ انھا انصاف ویکھ کے کنج بلھ سی لوے۔ انصاف وی بے انصافی نوں کیویں بچاوے۔ آپ وی مہاتڑ ساک، کرے تے کیہ کرے۔ پھیر وی ویکھ کے اکھ بند نہیں کر سکدا۔ پر انصاف دے ناں تے اپنے آپ دی قربانی تے دے سکدا اے۔ شاعر تے جان وی وان کر دے آئے نیں۔ اتھے وی اک شاعر انھے انصاف نوں ویکھ کے اپنیاں دوآں اکھاں

داوان دے رہے نیں تاں جے انصاف دوآں اکھاں اوہ وی کھول کے انصاف کرے۔ واہ سرندر جی واہ۔ تسیں اپنی شاعری راہیں اپنی کوملتا دے پھل اُگائے نیں۔

شعر ویکھو:

عدالت وچ ناحق مجرم کھڑا اعلان کردا ہاں
عدل انھے نوں میں دوئیں ہی اکھاں دان کردا ہاں

پورا پراگا سرندر سوہل ہوراں دیاں غزلاں اگ • دے بھانبڑ نیں تاں ہی ہوکیاں تے ہانواں چوں سیک ای نکلدا اے۔ ایہہ وی گل تاں دُکھ دین والی اے ناں۔ لگدا اے سرندر ہوراں تائیں حالے تیک خوشی نہیں بچی۔ جاں پئی ہوئی تاں بوہت ای گھٹ تے اوس گھاٹ دا تذکرہ ای کی۔ ایس پستک اندر تاں دکھاں دکھ نیں۔ پر اک گل دی سمجھ نہیں آئی۔ شیشے تے پھل کیویں کھڑے نیں یاں شاید سرندر ہوراں آن والے سمے وچ پھل کھڑن دی اُمید رکھی ہووے جے ایہہ گل سچی اے تاں ایس رب اگے ارداس کردے ہاں پئی سرندر سوہل ہوراں دی جھولی پھلاں نال رج کے بھر دیویں۔ آخر وچ اک ہور شعر سنا کے اجازت چاہواں گا۔

اس شعر وچ سرندر ہوریں اپنی آن، اَنکھ، مان مریادہ لے کے ساڈے ساہمنے کھلوتے نظر آوندے نیں۔ سیانے آہندے نیں جس بندے چ اَنکھ نہیں تاں اوہ بندہ ای نہیں۔ سو سرندر سوہل ہوری اپنی آن اَنکھ دا اظہار وی کردے نیں تے سامنے کھلوتے نوں چِتاونی وی دیندے نیں ملا اوہ کسے بھل وچ نہ رہے۔ آکھدے نیں:

پائی ہے اوڑ جن جنھیں اوہ سوچدی میں جھک گیاں
میں تاں جھکیا راہ چوں کنڈے ہٹاون واسطے

سرندر جی تہانوں اس غزلاں دے سنگریہہ دی ڈھیر ودھائیاں تہاڈیاں کامیابیاں دیاں اسیں منوں کامناں نال پئے تسیں اگانہہ وی لکھدے رہو گے۔ تہاڈے لئی شبھ کامناواں۔

اکھ توں اوجھل یار سی میرا
مریاں وچ شُمار سی میرا
جے میں اپنے جوگا مردا
مر جانا بیکار سی میرا
میں ویں ساں کجھ خوشیاں چاہندا
وکھرا کدوں وچار سی میرا
جگنو ساں پر اپنی تھاں تے
سُورج دا کردار سی میرا
خواباں والے گھر دا ویہڑہ
دُکھاں دے وچکار سی میرا
میں پُھلاں دا ہمسایا ساں
مونہہ پُھندی مہکار سی میرا
اپنا آپ سمیٹاں کیویں
مچیا ہویا کھلار سی میرا
انجدا کتے گواچ گیا ساں
لبھ لینا دُشوار سی میرا

فرانسس سائل/سیالکوٹ

بندا کہ حیوان

نکی جئی کڑی سی تے مکھ اوہدے نیلے سی
ٹھنڈ نال کنبی جاوے ہتھاں چ تیلے سی
روز تڑکے اٹھ کے اوہ سڑکوں پار جاندی سی
گجراں دی وہیلی چوں لسی لے کے آندی سی
حویلی دے لاگے شاگے بندا اک رہندا سی
دسیا سی کڑی نے کہ بندا اوہنوں کہندا سی
آ جا میرے گھر چیز تیرے لئی میں رکھی اے
ایڈی سوہنی چیز توں کدی وی نہیں تکی اے
اوہدے گھروں نے میں اوہدے نال چل پئی
اوہ وچکار اک ہور بڈھی رل پئی
کہن لگی چوراے تے نالے بے ایمان اے
ویکھنے نوں بندا اے تے اندروں حیوان اے
اللہ اوہدا بھلا کرے اوہنے میتوں موڑیا
بیڑا اوس بندے دا فیر کُنج رب روہڑیا
دوجے دن ٹریا اوہ سڑکو سڑکی جاندا سی
سامنے اک ہنڈے والا بوہت تیز آندا سی
ہناں ویکھے سامنے اوہ اک دم مڑیا
ہنڈے والا وچ وجا انج بیڑا تڑیا

ڈاکٹر سعید اُلفت

وردی والا

رات نوں میں وی رولا سن کے بجھ کے باہر گیا سی
پھڑیو اینوں پھڑیو اینوں انج دا شور پیا سی
لوکاں پھڑ کے پھینٹی لائی پچھیا وردی والے نوں
کردا چوریاں کردا پھرناایں پچھیا اس موہنہ کالے نوں
آکھا لگا نواں کم اے میں آں کم دا کچا
کم جے میتوں لبھدا جاوَو تاں ہو جاوَاں پکا

ڈاکٹر سعید اُلفت

دنداں دی بہار

روٹی کھان لگیاں پچا کے جدوں مار دا
فیر پتا لگدا اے دنداں دی بہار دا
موتی انمول جیڑے رب نے بنائے نیں
غلطی اے ساڈی جتھیں اپنی گنوائے نیں
آلے دانگوں موہنہ جدوں ہندا اے بمار دا
فیر پتا لگدا اے دنداں دی بہار دا
جیڑا انہاں موتیاں نوں رکھدا سنبھال کے
سمجھو کہ پتراں نوں رکھدا اوہ پال کے
جوہری مُل جاندا اے موتیاں دے ہار دا
فیر پتا لگدا اے دنداں دی بہار دا

ڈاکٹر سعید اُلفت

مچھر

آ مار مکایئے مچھر نوں فیر ہو جاں گے خوشحال اسیں
وچ پارکاں باغاں رہندا اے
پونہہ پونہہ جیسا کن وچ کہندا اے
ہن کُنج لکایئے بال اسیں
آ مار مکایئے مچھر نوں فر ہو جاں گے خشحال اسیں
ایہہ مچھر ڈاہڈا زہری اے
لاوندا ایہہ سوئی گہری اے
فر ہو جاندے بدحال اسیں
آ مار مکایئے مچھر نوں فر ہو جاں گے خشحال اسیں
ہر پاسے ڈینگی چھایا اے
ہُن موت دا ویلا آیا اے
میرا وی جی گھبرایا اے
کُنج لویئے ویلا نال اسیں
آ مار مکایئے مچھر نوں فر ہو جاں گے خشحال اسیں
ایہ جتیا ہویا ہر جا سی
ایہ اپنی موتے مر جا سی
فر کم وی ساڈا سر جا سی
جے چلیئے آگو نال اسیں
آ مار مکایئے مچھر نوں فر ہو جاں گے خشحال اسیں
گھر بار نوں اپنے صاف کریں
نہ گندے نوں توں معاف کریں
کم اپنے ہتھیں آپ کریں
فر بن جاں گے خدو خال اسیں
آ مار مکایئے مچھر نوں فر ہو جاں گے خشحال اسیں

ڈاکٹر سعید اُلفت

پنجاب رنگ

محمد جنید اکرم

کافی

ترساں تک تک تیریاں دکھاں
ہر دم آس ملن دی رکھاں
وے ماہی! چھم چھم وس اکھاں
وچ اُڈیک میں وہندی جاواں
ہولی وانگن کُکھاں
وے ماہی! چھم چھم وس اکھاں
رت اپنی نال بال کے دیوے
اُچ بنیرے رکھاں
وے ماہی! چھم چھم وس اکھاں
تیرے ورگا ہور نہ کوئی
میرے جیہاں لکھاں
وے ماہی! چھم چھم وس اکھاں
اُٹھدی بہندی ہر ساہ دے نال
زہر ہجر دا چکھاں
وے ماہی! چھم چھم وس اکھاں

نام اللہ دا جپ
باقی سب کجھ کھپ
بس اوئے بھائیا بس
چک کتاباں ٹھپ
عقل علم دیاں گلاں
سن کے چڑھدا ای تپ
گرجے، مندر، مسجد
سانبھی بیٹھے سپ

عشقا! نکل میدانے
سری ایہناں دی نپ
ہے دنیا مردار ایہہ
کتنے کن ہڑپ
ایتھوں جت جت جاون
عقلاں سارے کپ
چل اوئے بھائیاں عشقا!
پل صراطوں ٹپ
ناپی گھار وساوے؟
سب توں وڈی گپ
ڈاڈن جنید نیں عقلاں
عشق اساڈا اَپ

کیوں کیتی پھلوں کنڈ ماہیا
ہن پانائیں کاہنوں ڈنڈ ماہیا
اساں چپ چپیتے دڑ وٹ لئی
توں شہر چ ساڈی بھنڈ ماہیا
اسیں لاڈ لڈاندے رہے تیرے
توں کردا جاویں کنڈ ماہیا
جا جیوندا وسدا رہو شالا
تری کنڈ وی ساڈی ٹھنڈ ماہیا
جس پائے پاٹ اساڈے وچ
اوس منہ تے ماراں چنڈ ماہیا

اپنی آپ اُڈائی مٹی
اپنے سر چ پائی مٹی
تن جہا کھڑا دب دبا کے
مٹی نال سجائی مٹی
پانی، بجلی، روٹی، کھا کے
خلقت خوب رُوائی، مٹی
اندروں کالم کالا تن
اُتے چٹری پائی چٹی
لوکو ماں دی قدر پچھانو
واجاں دیوے مائی مٹی
کے ساہ جنید اکرم تے
مٹی وچ دبائی مٹی

معروف شاعر اور ادیب
زاہد محمود شمس کی
پیام شمس (شعری مجموعہ)، رم جھم (بچوں کا ادب)
پیار لازم ہے (شعری مجموعہ) کے بعد
بچوں کی نظموں اور کہانیوں پر مشتمل
اصلاحی کتاب
''محنت کرتے جاؤ بچو''
مکمل اہتمام کے ساتھ شائع ہوگئی ہے
ملنے کا پتہ:
نستعلیق مطبوعات
F-3 الفیروز سنٹر، غزنی سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور

پنجاب رنگ

متفرق شاعری

گھپ ہنیرے تے میں کلی
دور سویرے تے میں کلی
دکھ دے شیر شوکاں مارن
چار چُفیرے تے میں کلی
لمی رات اُڈیکاں والی
اتھرو میرے تے میں کلی
تیرے طعنے مارن والے
لوک بتھیرے تے میں کلی
دل دا حال سناواں کنوں
درد گھنیرے تے میں کلی
رُسدے جاندے غیراں کولوں
سجنے تیرے تے میں کلی
کئی عمرے پلے پے گئے
دکھ لمیرے تے میں کلی
گل غریب دا حق کھولیندے
لوگ وڈیرے تے میں کلی

گمنام نقوی

دے کے اپنا اک اک سال حیاتی نوں
کر دیواں گا مالا مال حیاتی نوں
سبز بنا کے سارے موسم اندر دے
بھر دے سرخ گلاباں نال حیاتی نوں
ناکامی دی خاک چٹا کے حسرت نوں
اُمیداں دا رُوپ وکھال حیاتی نوں
اوڑک آپ نشان بن گے عبرت دا
جہاں کیتا اے بے حال حیاتی نوں

ہمایوں پرویز شاہد، لاہور

دوزخ دی اگ پچھلاں اُتے رکھی ہے
سچ کڑتن، جدوں کدے وی چکھی ہے
میں کھیالی نہیں تھلے ستا ہاں
چار چفیرے ڈگن والی رکھی ہے
پیار محبت کوڑی جنی کول نہیں
آکھن نوں او کروڑ پتی اے لکھی ہے
باہر دیاں نوں مٹھیاں چیزاں ونڈدے جو
گھر دیاں لئی اس زہر لکو کے رکھی ہے
کیہڑا کیہڑا پاسا ویکھیں گا؟ افضال!
پیڑ غماں دے زخماں دی بہہ چکھی ہے

ڈاکٹر محمد افضال/ مالیرکوٹلوی

زور اور توں زور اور
آخر جاندا اوہ وی مر
ہمت والا بندا تے
کرے ہمالہ وی اوہ سر
ہتھ جے دووِیں صاف ترے نیں
لاوہ دستانے توں نہ ڈر
نفس نوں قابو کر لے جو
بندا او ہی ہوندا نر
اوہدی کوئی پچھان نہیں ہوندی
جیہدا نہیں کوئی اپنا گھر
کسے نوں مشکل وچ نہ پا
دکھڑے اپنی جان تے جر
ہووے اوسدا کرم رحیل
ڈبی بیڑی جاوے تر

عاشق رحیل

وڈی گل

چاردناں دی
دُنیا اندر
چاردناں دے
میلے ٹھیلے
انج دے سودے
گھاٹا ای گھاٹا
ایہناں خاطر
اصلی دُنیا دے لئی
توں نہ ایویں
بھیڑ کماویں

خواجہ آفتاب عالم بٹ/گوجرانوالہ

نامہ ہائے احباب

پیارے حسن عباسی صاحب!

دُعائیں۔ ماہ نامہ ''ارژنگ'' مرقع حسن و جمال ملا۔ آپ جیسی شاعری کرتے ہیں ویسے ہی ادارت بھی خوب صورت کرتے ہیں۔ ارژنگ کی حسن عباسی رعنایتیں دل کو لگیں۔ اچھے اور پیارے شاعر عامر بن علی بھی رسالے کی رعنائیوں میں بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں۔ شرح ''اشعار امیر خسرؒ'' نے دل موہ لیا۔ جیسی اشعار کی من موہنی ویسی ہی تحریر کی مہ روپی۔ آپ تحریروں کے انتخاب اور ترتیب میں کمال حسن ظن سے کام لیتے ہیں حسن عباسی جو ہوئے۔ یہ ''آمین گوئی'' قطعی نہیں، حقیقت ہے۔ عطاء الحق قاسمی ''بے وفا ہیرو'' میں پرویز مشرف کے حوالے سے کیا کہنا چاہتے ہیں؟ خوب ہے:

پرندے جب کر رہے تھے ہجرت
میں اک شجر سے لگا کھڑا تھا
(حسن عباسی)

حمد، نعت، سلام کی عقیدتیں بہت متاثر کرتی ہیں۔ رمضان میں ان کی تاثیریں اور بھی شدت سے محبوب ہوتی ہیں۔ ارژنگ کے شعری اور نثری معیارات دل میں ''بسان جوگ'' ہیں۔ زیادہ کیا کہوں۔ المختصر بہت اچھا رسالہ ہے۔ میرا پچھلا خط آپ کو شاید نہیں ملا۔

خیر اندیش

آصف ثاقب

ہزارہ

جناب حسن عباسی صاحب!

السلام علیکم۔ آپ کا ''ارژنگ'' ملا۔ آپ کی محبتوں کا بہت بہت شکریہ۔ ایک غزل ارسال خدمت ہے۔ فقط والسلام

نصرت صدیقی

فیصل آباد

محترم جناب حسن عباسی صاحب!

السلام علیکم۔ ''ارژنگ'' کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا۔ شکریہ اور مبارک باد۔ فلسطینی شاعرہ اور ادیبہ ڈاکٹر حنان عواد کا عامر بن علی کے ساتھ مکالمہ موجودہ شمارے کی خوبصورتی اور اہمیت کو اُجاگر کرتا ہے۔ نظموں اور غزلوں کا انتخاب پسند آیا۔ حصہ نثر تنگیٔ داماں لیے ہوئے ہے۔ انشائیہ، افسانہ اور تحقیق و تنقیدی موضوعات پر مضامین لکھنے والے بہت لوگ ہیں اُن سے رجوع کریں۔ اللہ تعالیٰ ''ارژنگ'' کو دن دُگنی اور رات چوگنی ترقی عطا کرے۔

شکیب جلالی مرحوم کا ایک غیر مطبوعہ منقبت (جو اُن کے کلیات میں بھی شامل نہیں) ارسال کر رہا ہوں۔ ارژنگ کی اگلی اشاعت میں اسے شامل کرنے کی سعادت حاصل کیجیے۔

میں اپنی ایک حمد اور نعت ''ارژنگ'' میں اشاعت کے لیے بھیج رہا ہوں۔ اُمید ہے ارژنگ کے قارئین انھیں پسند فرمائیں گے۔

خیر اندیش

مظفر حسن منصور/ جوہر آباد

برادرم! سلام مسنون۔ پچھلے تقریباً چھ ماہ سے میں امریکہ کینیڈا کے دورے پر تھا۔ مجھے بڑی شرمندگی ہے کہ ''ارژنگ'' گاہے گاہے ملتا رہتا ہے۔ مگر میں اس کی رسید بھی نہیں بھیج پاتا۔ بہر حال چند چیزیں بھیج رہا ہوں۔ خوبصورت اور خوب سیرت پرچہ ترتیب دینے پر مبارک باد قبول فرمائیں۔ احباب کو ہدیہ سلام اور آنے والی عید مبارک۔

خیر اندیش

جمال نقوی

محترم حسن عباسی صاحب! آداب

ارژنگ ہر ماہ باقاعدگی سے بھجوانے پر آپ کی شکر گزار ہوں۔ یہ بلاشبہ شعر و ادب کی خدمت کرنے والا اپنی طرز کا منفرد رسالہ ہے۔ جو نہ صرف ادب کی خدمت کر رہا ہے بلکہ ہمارے ذوق کی تربیت بھی۔

آپ کے لیے اور ارژنگ کی تمام ٹیم کے لیے بہت سی دُعائیں۔ والسلام

عزت مآب

شیخوپورہ

جناب ناز اوکاڑوی صاحب

السلام علیکم۔ ماہنامہ ارژنگ کا شمارہ جولائی 2014 بذریعہ ڈاک موصول ہوا۔ عالمی شہرت یافتہ فلسطینی مصنفہ کا انٹرویو پڑھ کر ان کے ادبی اور سیاسی نظریات جاننے کا موقع ملا۔ نیز پاکستانی قلمکاروں کے بارے میں ان کے جذبات سے آگاہی ہوئی۔ علی یاسر کے بارے میں اصغر عابد صاحب کا مضمون نہایت بصیرت افروز تھا۔ جیسے دیگ کے چند چاول دیکھ کر اُن کے کچے یا پکے ہونے کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے اس طرح علی یاسر کے نموناً دیے گئے اشعار پڑھ کر ان کے تخیل کی پرواز، سوچوں کی اُڑان، ندرت اور آنے والے دور میں ان کے مقام کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ ان کے مجموعہ کلام پڑھنے کو بے ساختہ دل چاہتا ہے۔

پروفیسر عاشق راحیل صاحب کا مضمون شیخ ایاز کے بارے میں ان کی حیاتی کے تمام گوشوں پر محیط تھا۔ ایک متنازعہ شخصیت ہونے کے باوجود ان کے کام کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ تمام تحاریر جاندار تھیں۔ نظم ونثر میں البتہ سے اپنی اپنی ہے جام اپنا اپنا ہے۔ ہر ایک شاعر کا کام اپنا اپنا ہے۔ وہی اچھا ہے جو دل کو بھا جائے۔

قمر حجازی

اوکاڑا

جناب حسن عباسی صاحب!

السلام علیکم۔ احتشام جمیل شامی صاحب کی وساطت سے مئی 2014ء کا شمارہ مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ ماہنامہ ارژنگ واقعی مانی و بہزاد کا خوبصورت طلسم کدہ دکھائی دیتا ہے۔ ظاہری وقار، معیاری کاغذ، نفیس چھپائی اور اس میں شامل تحریرات کا تنوع جو پہلو اُجاگر کر رہا ہے وہ اپنی جگہ ایک الگ خوبی ہے۔ غزل اور نظم کا حسن دلکش بھی ہے۔ ندرت، بندشِ الفاظ اور نئی تراکیب کا مرقع بھی۔ راجا نیز کی شش جہت شخصیت کا گوشہ کتنے ہی پردے ہٹاتا دکھائی دیتا ہے۔ جناب تنویر ظہور، ڈاکٹر محمد عثمان اور ناز اوکاڑوی کے جامع اور بھرپور تبصرے کتابوں کا خوبصورت منظر پیش کر رہے ہیں۔ عطاء الحق قاسمی صاحب کا طنز ومزاح سے بھرپور کالم ''ہنسنے پہ پابندی'' ایسا نشتر ہے جس کی چبھن اس وقت محسوس ہوتی ہے جب وہ دل کے قریب سے گزرتا ہے۔ قہقہوں کی چلمن کے پیچھے دکھوں اور المیوں کو چھپانا ہر کسی کے بس کا روگ نہیں۔

نیلم احمد بشیر کا افسانہ ''تھوڑی سی تنہائی نسوانی جذبوں کا نفسیاتی تجزیہ بھی ہے اور اکلاپے کا شکار عورتوں کی سوچوں کا عکس بھی۔ روشانے سبحین کا افسانہ ''بانجھ محبت کا دکھ'' حقیقی محبت کو ترسنے والی عورت کی کہانی بھی ہے اور آسودگی اور ناآسودگی کا درمیانی خاکہ بھی۔ علی اختر کا افسانہ ''اچھا'' ہماری سوسائٹی کے جس المیہ کو پیش کرتا ہے وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ بے روزگار نوجوانوں کی مکمل نمائندگی کرتا ہے۔ ایک طرف دولت کے لیے خودکش جیکٹ پہننا اور دوسری طرف معصوم بچے کی جان بچانے کی سوچ دل اور دماغ کے فیصلوں کے تضاد کو نمایاں کرتا ہے۔ ہر تحریر اپنی اپنی جگہ قابل توجہ بھی ہے اور لائق ستائش بھی۔ فقط

قمر حجازی

اوکاڑہ

پیارے حسن بھائی سلام مسنون!

کل میں نے آپ کو کافی چیزیں ارسال کیں۔ ان شاء اللہ وقتاً فوقتاً یہ سلسلہ جاری رہے گا اور اللہ نے چاہا تو آئندہ ماہ کے شروع میں ارژنگ کا زرِ سالانہ بھی ارسال کروں گا۔ آپ کی محبتیں میرا سرمایہ ہیں۔

اچھا کل والی چیزوں میں ایک غزل کے ایک مصرع میں جانے کیسے دو لفظ کاغذ پہ لکھتے ہوئے مجھ سے رہ گئے۔ اس کی نفسیاتی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ شاید میں جو ہر لحہ شعر میں نئی سے نئی تبدیلی کی کوشش میں رہتا ہوں کتابیں چھپ جاتی ہیں اور میرا تبدیلیاں کرتے رہنے کا عمل پھر بھی ہمہ وقت جاری رہتا ہے۔ تو میں سوچ رہا تھا کہ یہاں ''جو'' اور ''یہ'' کی کمپوز کیجیے اور شائع کیجیے گا۔

گئے موسموں کا جو دھیان آئے تو سوچتا ہوں یہ بات میں

اس مصرعے میں میں (جو) اور (یہ) کے الفاظ لکھنا بھول گیا تھا۔ درست فرما لیجیے گا۔ شکر ہے چیزوں کی فوٹو کاپیاں رکھی ہوئی تھیں۔ رات کو ایسے ہی دوبارہ دیکھی ہیں تو منکشف ہوا۔ الحمدللہ باقی چیزوں میں لکھتے ہوئے کوئی سہو نہیں ہوا۔

میرا دوسرا مجموعہ کلام اشاعت کے لیے بالکل تیار پڑا ہے اور ان شاء اللہ اس کو بھی آپ نے ہی شائع کرنا ہے۔ انشاء اللہ میری تمام کتابیں آپ ہی شائع کریں گے۔ اس مرتبہ میری کتاب تقریباً 120 صفحات کی

بن رہی ہے۔ بہت دعا

آپ کا بھائی

حسن جمیل

منیر آباد، لالہ رُخ، واہ کینٹ

جناب عامر بن علی صاحب!

سلام مسنون۔ عند الیقیں آپ مع الخیر ہوں گے!

آپ سے تعارف آپ کے گھر (میاں چنوں) پہ ہوا تھا۔ مشاعرہ کے دوران پھر استاد محترم ارشاد جالندھری صاحب کے بارہا اصرار پر آپ کو "ارژنگ" کے لیے کلام ارسال کیا تھا لیکن پرچہ موصول نہ ہونے کی صورت میں رابطہ برقرار نہ رہ سکا اور اب پھر سے انہی کے اصرار پر ایک بار پھر تقریباً 2 سال کے بعد پھر سے "ارژنگ" کے لیے کلام پیش خدمت ہے۔

آپ نے "ارژنگ" ارسال فرمایا تو انشاء اللہ رابطہ رہے گا۔

منتظر دُعا گو

نازیہ رحمٰن ناز

قابل صد احترام حسن بھائی!

السلام علیکم۔ اُمید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔ دورہ بھارت مبارک ہو۔ رابطہ کرنے کی بہت کوشش کی مگر نہ ہو سکا۔ ارژنگ کے لیے کچھ چیزیں ارسال ہیں۔ شامل اشاعت کر لیجیے۔ غزلوں کا گوشہ لگوا دیں اگر مناسب ہو تو۔

برادر عزیز

ندیم نیازی

سبی

محترم ناز اوکاڑوی جی!

السلام علیکم۔ آس اے تسی خوش باش ہو سو تہاڈی ذرہ نوازی اے کہ تسی وقتاً فوقتاً اپنا سوہنا پرچہ "ارژنگ" نوازدے رہندے او۔ رب سوہنا تہانوں آباد رکھے۔

کجھ شاعری ارسال کر رہیا واں چنگی لگے تاں چھپ دینا۔

تہاڈا اپنا

ملک شعیب انجم تبسم

محترم حسن عباسی صاحب!

السلام علیکم۔ اُمید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔ اک دوست کے توسط سے آپ کا ادبی پرچہ ماہنامہ ارژنگ ملا۔ بہت خوشی ہوئی کہ اس نازک دور میں بھی ادبی دنیا کے لیے کام کرنے والے احباب موجود ہیں جو کہ ادب کے لیے ہر لحہ کوشاں ہیں اور ہمیشہ چاہتے ہیں کہ دنیائے ادب ترقی اور ترویج کی طرف جائے تاکہ ادبی دنیا پھل پھول سکے اور حقیقت میں ادبی دنیا کی خدمت کرنے والے تمام احباب داد اور تحسین کے لائق ہیں۔ ان کے لیے دلی دعا ہے کہ خدا اُن کو ہمیشہ آباد و شاد رکھے اور وہ ادب کی ترقی کے لیے یونہی کام کرتے رہیں۔ ان ادبی خدمت گاروں میں اک بہت ہی خوبصورت اور پیارے شاعر جناب حسن عباسی صاحب ہیں جو ادب کی خدمت کے لیے بہت بڑا حصہ ڈالتے ہیں اور اُس خدمت کا صلہ ہمیں ادبی ماہنامہ "ارژنگ" کے ذریعے عطا کرتے ہیں جن کو لفظوں کے ذریعے داد و تحسین پیش کرنا زیادتی ہوگی۔ اُن کے اس انتہائی اہم اور خوبصورت قدم کے کیا کہنے ہیں۔ ارژنگ کے ذریعے دنیائے ادب میں بہت سے نئے لعل و جواہر منظر عام پر آ رہے ہیں جن سے میں اُمید کرتا ہوں کہ یہ لعل جواہر ارژنگ اور ہمارے پیارے ملک کا نام زندہ و تابندہ کریں گے اور دُنیائے ادب کا نام روشن کریں گے۔ پہلے بھی دو دفعہ نگارشات آپ کے حکم پر بھیجی تھیں مگر شائع نہیں ہوئی۔ دوبارہ ارسال کر رہا ہوں اُمید ہے کہ ضرور پسند آئیں گی۔ اک اور شکایت ہے آپ سے کہ آپ نے اپنی کتاب بھیجنے کا وعدہ کیا تھا جو کہ آپ نے پورا نہیں کیا جس پر میں آپ سے دوبارہ کتاب ارسال کرنے کی استدعا کرتا ہوں۔ جس سے میں اپنی ادبی پیاس کو سیراب کروں گا اور آپ کے کلام سے سیکھنے کی کوشش کروں گا۔ بڑا شاعر تو نہیں ہوں مگر پڑھ تو سکتا ہوں اور سیکھ بھی سکتا ہوں۔ ہاتھ پر بہت گہرا زخم ہونے کی وجہ سے میں رائٹنگ اچھی نہیں کر سکوں گا اس کے لیے معذرت کرتا ہوں جتنی کوشش کر سکتا تھا مکمل طور پر کر رہا ہوں۔ اگر کوئی غلطی ہوگئی تو معاف کیجیے گا۔ عین نوازش ہوگی۔ اگر مہربانی ہو سکے تو اک نیا اور اک پرانا پرچہ ماہنامہ "ارژنگ" ارسال کر دیجیے گا یہ بھی استدادانہ طور پر کہہ رہا ہوں تاکہ آپ کی تمام کوششوں کو سراہا جائے اور لوگوں سے انصاف کروایا جائے۔ سلام و دعا کے ساتھ اجازت چاہوں گا۔ فقط والسلام

دُعا گو

ساجد رضا خان

بچپن سے ہی جاسوسی کہانیاں اور بچوں کے میگزین پڑھنے کا بہت شوق تھا

قمر ریاض

معروف شاعر، افسانہ نویس اور پاکستان سوشل کلب لٹریری ونگ (اومان) کے جنرل سیکرٹری قمر ریاض سے حسن عباسی کی گفتگو

ارژنگ: اپنی ابتدائی زندگی اور تعلیم کے بارے میں کچھ بتائیں۔

قمر ریاض: ابتدائی زندگی بالکل عام بچوں کی طرح گزری۔ میرے والد چوہدری ریاض احمد پہلے ابوظہبی اور پھر اومان (مسقط) میں بزنس کے سلسلے میں مقیم رہے۔ جب ہوش سنبھالا تو بڑا بیٹا ہونے کی وجہ سے بہت لاڈ پیار ملا۔ خاص طور پر والد کا بے شمار پیار میرے حصے میں آیا۔ جو باقی بہن بھائیوں کی پیدائش کے بعد بھی اس طرح قائم ہے۔ بلکہ اکثر مذاق میں بھائی اور بہن کو امی سے یہ شکایت رہتی ہے کہ وہ مجھ سے نسبتاً زیادہ پیار کرتی ہیں اور سچ بات تو یہ ہے کہ میرے لیے بھی میری امی جی کی دعائیں اور میرے ابو جی کی محبت ہی میری زندگی کا کل اثاثہ ہے۔

میرا تعلق گوجرانوالہ کے ایک چھوٹے سے شہر علی پور چٹھہ سے ہے۔ جیسا قصبوں میں اکثر ہوتا ہے۔ خالی پلاٹوں میں یا اسکول کی گراؤنڈ میں کرکٹ کھیلنا، بنٹے کھیلنا، سنوکر، بلیئرڈ اور اس طرح کے کھیلوں کے ساتھ ساتھ نہر میں نہانا اور پیڑوں سے جامن اُتارنے سے لے کر امرود توڑنے تک سارے کام اپنے بچپن میں کیے۔

امی جی کی ڈانٹ اور مار بھی ساتھ ساتھ بچپن اور لڑکپن کی خوبصورت یادوں میں شامل ہے۔ میٹرک تک تعلیم گورنمنٹ ہائی سکول علی پور چٹھہ سے حاصل کی۔ اس اسکول کی سب سے خاص بات یہ ہے کہ اس میں نظم کے سب سے اہم شاعر ن م راشد نے میٹرک تک یہیں سے تعلیم حاصل کی۔ ان کا نام آج بھی اسکول کے امتیازی بورڈ پر درج ہے۔ اس بات کا پتا شعر و ادب کی طرف آنے کے بعد چلا اور اس پر اب فخر محسوس ہوتا ہے۔

ارژنگ: شعر و ادب کی طرف کیسے آنا ہوا اور ابتدا میں رہنمائی کس سے حاصل کی؟

قمر ریاض: مجھے بچپن سے ہی جاسوسی کہانیاں، بچوں کے میگزین پھول اور اطفال پڑھنے کا بہت شوق رہا اور کسی نہ کسی طرح انہیں پڑھنے کی سہولت بھی رہی۔ یہاں سے سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ بزمِ ادب اور تقاریر میں حصہ لیتا رہا۔ میرے ادب میں خراب ہونے کا اندازہ اس بات سے لگائیں کہ میٹرک کا امتحان پاس کرنے سے قبل میں سعادت حسن منٹو کے بیشتر افسانے اور بانو قدسیہ کا شاہکار ناول راجہ گدھ پڑھ چکا تھا اور شاعری میں بھی احمد فراز، محسن نقوی، ناصر کاظمی اور پروین شاکر کے ناموں سے نہ صرف متعارف ہو چکا تھا بلکہ ان کے کئی اشعار بیت بازی میں پڑھتا تھا اور اکثر جیت جاتا تھا میٹرک کے بعد اوورسیز کے کورس کے لیے گورنمنٹ کالج آف ٹیکنالوجی سرگودھا گیا تو وہاں میری ملاقات کالج کے استاد اور ہوسٹل وارڈن یوسف خالد سے ہوئی۔ ان کا شمار سرگودھا کے انتہائی نامور شعراء میں ہوتا ہے اور گزشتہ 7 سالوں سے وہ بلا مقابلہ سرگودھا رائٹرز کلب کے صدر ہیں۔ انہوں نے ہمیشہ ہوسٹل میں ہم نصابی سرگرمیوں کو فروغ دیا۔ ابتداء میں انہی سے میں نے استفادہ کیا۔ میں دو سال ہوسٹل لٹریری ڈیپارٹمنٹ کا سیکرٹری جنرل رہا ہر مہینے بزم ادب کے پروگرام ہوتے جس میں وہاں کے نامور ادیب اور شاعر شرکت کرتے۔ ادبی اور علمی گفتگو کرتے۔ وہاں میرا ادب کی طرف راغب ہونا فطری بات تھی۔ خاص طور پر شاعری اور افسانہ میری محبوب ادبی اصناف بن کر سامنے آئیں۔ اردو اور پنجابی

> میٹرک کا امتحان پاس کرنے سے قبل سعادت حسن منٹو کے بیشتر افسانے اور بانو قدسیہ کا ناول "راجہ گدھ" پڑھ چکا تھا

بقیہ صفحہ نمبر 33

پنجاب انسٹیٹیوٹ آف لینگویج، آرٹ اینڈ کلچر کے زیر اہتمام

عامر بن علی اور قمر ریاض کے اعزاز میں محفل مشاعرہ

میزبان: رخسانہ نور

تقریب کی صدارت عطاء الحق قاسمی نے کی جبکہ مہمان خصوصی نجیب احمد، شفیق سلیمی تھے

نظامت: ڈاکٹر صغرا صدف

عطاء الحق قاسمی

تقریب کے دوسرے سیشن کی صدارت بشریٰ رحمن نے فرمائی جبکہ مہمانان خصوصی حسین شاد اور باقی احمد پوری تھے۔

بشریٰ رحمن

مشاعرے میں شریک شعراء کرام

اسلام عظمی

سرفراز شاہد

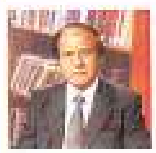

اعزاز احمد آذر

باقی احمد پوری

اقبال راہی

نجیب احمد

وصی شاہ

افضال فردوس

حمیدہ شاہین

عباس تابش

ممتاز راشد

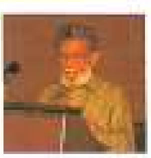

حسین شاد

ناز بٹ

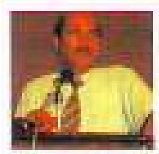

آفتاب جاوید

فراست بخاری

ملک سلیم اختر

ابرار ندیم

حسن عباسی

Read Arxang Online
www.amirbinali.com
www.millat.com

نستعلیق Publications
غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور
0300-4460318 - 042-37351063
nastaliqus786@gmail.com